صفر المظفر۔ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
جنوری۔ مارچ ۲۰۱۲ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسس: ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

اُسوہ وسیرتِ رسول اکرم ﷺ

پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

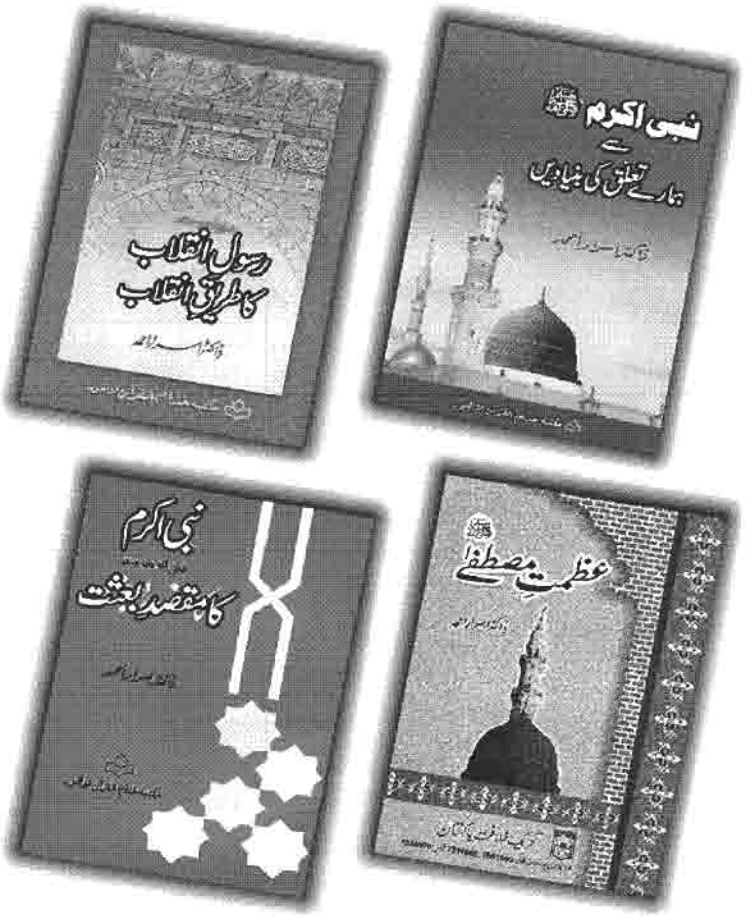

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501

email:maktaba@tanzeem.org

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا (البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۱ — شمارہ ۱

صفر المظفر۔ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ — جنوری۔ مارچ ۲۰۱۲ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم ۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیر: حافظ عاطف وحید

نائب مدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ حافظ نذیر احمد ہاشمی
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 3-35869501

ویب سائٹ : www.tanzeem.org

ای میل: publications@tanzeem.org

سالانہ زرتعاون: 200 روپے، فی شمارہ: 50 روپے

اس شمارے میں

حرفِ اوّل

ربانی ٹیلی گرام: انسانیت کے نام	ڈاکٹر ابصار احمد	3

یادِ رہبر

بانیٔ محترمؒ کا فکر اور پیغام	حافظ عاکف سعید	7

مضامینِ قرآن

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ	ڈاکٹر اسرار احمدؒ	9

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	21

حکمتِ نبویؐ

ذکر اللہ کی فضیلت	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	31

فقہ و اجتہاد

اجتہاد کا اجتماعی منہج	مفتی محمد تقی عثمانی	35

بحث و نظر

رسالة فی بیع النسیئة	امام محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی	44

شخصیات

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی وادبی خدمات	محمد انس حسان	56

کتاب نما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	74

تقدیرِ اُمم

The History of Muslim Spain	Dr. Israr Ahmad	85

بیان القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

رَبّانی ٹیلی گرام: انسانیت کے نام

بحمداللہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا ۳۹واں سالانہ اجلاس ۱۸/دسمبر ۲۰۱۱ء بروز اتوار قرآن آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن جناب ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی اپریل ۲۰۱۰ء میں اس دارِفانی سے رحلت ہم سب کے لیے بڑا سانحہ اور صدمہ تھا' لیکن ان کے ہم مقصد ساتھی' اعوان وانصار اور جملہ اراکین انجمن حسبِ سابق انجمن کی تحریک دعوت رجوع اِلی القرآن کی ہمہ جہت مساعی میں نہ صرف دلچسپی لے رہے ہیں بلکہ دامے درمے سخنے قدمے کوشاں ہیں اور تعاون جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان شاءاللہ یہ جملہ وابستگان عنداللہ ماجور ہوں گے' کیونکہ یہ سب حضرات پورے خلوص کے ساتھ ایک اہم دینی فریضے یعنی کتاب اللہ کے پیغام وہدایت کی اشاعت وتوسیع کے مبارک کام میں شریک ہیں۔ اور ان کی وابستگی صرف ایک فرد یعنی مرحوم ومغفور صدر مؤسس کے ساتھ ذاتی تعلق کی بنیاد پر نہیں تھی بلکہ رضائے الٰہی کے حصول اور اخروی نجات کے لیے ہے۔ چنانچہ سالانہ اجلاس کا انعقاد اس اعتبار سے بھی ہم سب کے لیے اِنبساط اور اطمینان کا باعث تھا کہ اللہ کے فضل وکرم سے مرکزی انجمن نے بغیر کسی حادثے یا بالفاظِ دیگر بغیر اِنتشار وافتراق کے ۳۹ سال مکمل کر لیے' فللّٰہ الحمد والمنۃ!

ڈاکٹر اسرار صاحبؒ نے اپنے قرآنی فکر میں ملّتِ اسلامیہ اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کی ایمانی صورتِ حال کی تشخیص جس تفصیل اور دقّتِ نظر سے کی اور ان کمزوریوں کا جو علاج نہ صرف تجویز کیا بلکہ طویل عرصے اس کے لیے عملی جِدّوجُہد بھی کی' اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت عصرِ حاضر کے دو اَمراض کا شکار ہے' اور یہ دو امراض شُبہات اور شَہوات ہیں۔ شبہات اور فکری اھواء (یعنی intellectual whims) علمی اعتبار سے ہمارے اَذہان کا روگ ہیں جو ہمارے قلوب میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری نہیں ہونے دیتے۔ یہ شبہات بالخصوص تعلیم یافتہ اصحاب میں بہت سے خوشنما رنگوں اور گوناگوں عنوانات کی شکل میں موجود ہیں اور عقل وفہم پر وائرس کا سا اثر رکھتے ہیں' نتیجۃً ایمان ویقین کی جگہ ارتیابیت اور تشکیک کو پروان چڑھاتے ہیں۔ اس طرح اغیار اور ان حضرات کا یہ موقف سامنے آتا ہے کہ قرآن آزادانہ عقلی بحث ونظر میں رکاوٹ ہے' اس کی تعلیمات جامد اور انسانی عقل کو پابندِ سلاسل کرتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس یہ ہے کہ گزشتہ دو اڑھائی صدیوں کے درمیان مسلمانوں کے علمی انحطاط اور سائنسی تنزل کے اسباب بالکل دوسرے ہیں۔ قرآن درحقیقت وہ واحد الہامی نوشتہ ہے جس نے پرزور اور کھلے الفاظ میں اپنے مخاطبین کو عقل وفہم اور تفکّر وتدبّر سے کام لینے کی دعوت دی ہے۔ جو انسانوں کو نہ صرف آفاق وانفس میں غور وفکر کی تلقین کرتا ہے بلکہ مختلف مسائل و

معاملات میں غیر علمی روش اور اوہام پرستی کی بجائے علمی اور سائنسی منہاج اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ دوسرا مرض ہوائے نفس، ادنیٰ خواہشات کے کثائف اور شہوات (animal desires & ambitions) کے حوالے سے ہے جو ہمیں بری طرح گھیرے رکھتی ہیں اور ہم پر مسلّط ہو کر، از روئے قرآن 'اسفل سافلین' کے پاتال میں دھکیل دیتی ہیں۔ اس تناظر میں برادرِ بزرگ ﷾ نے جس جس انداز سے قرآن مجید کی اہمیت و مرکزیت کی طرف ہماری مؤثر رہنمائی کی ہے وہ ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی۔ علمی ممارست، گہرا یقین اور قرآن کا قال ''حال'' بن جانا—— یہ وہ اُمور تھے جو ان کی مجالس دروسِ قرآنی میں بتمام و کمال نظر آتے تھے۔ چنانچہ پاکستان اور بیرونی ممالک میں کثیر تعداد میں ایسے حضرات ہیں جن کی زندگیوں میں ان کے خطابات اور کتب نے اسلام کے مطابق نہ صرف زندگی بسر کرنے بلکہ اس کا فعال داعی بننے کا جذبہ پیدا کیا۔

ڈاکٹر صاحب ﷾ کے تمام دروسِ قرآن اور دینی موضوعات پر تقاریر اور تحریریں قرآنی اصالت اور موجودہ حالات و مسائل کے درمیان تطبیق کی سنجیدہ کوششیں ہیں۔ انہوں نے شعوری طور پر واضح انداز میں یہ جان لیا تھا کہ تحریک رجوع اِلی القرآن کسی سہل اور جلد نتیجہ خیز عمل (quick fix) کی بجائے ایک لمبی، مسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ کی گئی جدوجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے جب بعض ناقدین اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں اور تقریروں میں عقلی اِستدلال اور حکمت کی تبیین غالب ہے جبکہ تذکّر کا پہلو دبتا ہوا ہے، یعنی عنصرِ روحانیت اور جذب و کیف کی کمی ہے۔ جبکہ میرے خیال میں یہ اعتراض کسی طور پر بھی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتا۔ یہ حضرات غالباً اس امر واقعہ سے دانستہ یا نادانستہ اغماض برتتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے عنصرِ روحانیت اور ایمانی و عرفانی جذب و کیف اور حقیقی و باطنی ایمانی احساسات کے حوالے سے ''تحریکِ جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ'' میں اپنا موقف بالوضاحت بیان کیا ہے، اور مختصر الفاظ میں اپنے اہم کتابچے ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام'' میں ''تعبیر کی کوتاہی'' کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا ہے۔ لہٰذا وہ اس سے صرف نظر کیونکر کر سکتے ہیں؟ دین کو کتابوں کی بجائے ہر ہر انسان کے قلب و احساسات پر مرتسم ہونا چاہیے۔ صرف عقلی استدلال اور دانشورانہ موشگافیوں میں حتمیت اور اذعان کی بجائے فکر و تعمق کے الجھاؤ ہیں اور دانش و عقل کے پیدا کردہ شکوک ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ علامہ اقبالؒ کے شیدائی تھے اور انہی کی طرح تدبّر و تفکّر کے ساتھ حُبِّ و عشقِ الٰہی کو از بس ضروری خیال کرتے تھے۔ خالق کائنات کے ساتھ شدید محبت اور مکمل اطاعت توحید کا لازمہ ہے۔ علامہ کا ''رموزِ بے خودی'' کا یہ شعر سادہ الفاظ میں اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے ؎

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

قرآن کی مرکزیت اور اہمیت کے حوالے سے گزشتہ دنوں ایک مسلمان مغربی مصنف کی کتاب میں چند سطور مطالعہ میں آئیں جو حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتی معلوم ہوئیں۔ یہ اسلوبِ اظہار ان کے قرآن کے عمیق مطالعہ اور گہرے فلسفیانہ انداز کی غمازی کرتا ہے:

"Laconic in its authority, the Quran is written with the urgency of a telegramme."☆

قرآن کریم کی ابتدائی مکی سورتیں واقعتاً جھنجھوڑنے اور لرزہ طاری کر دینے والی ہیں۔ ان مکی سورتوں کے تاثر کو ٹیلی گرام کی ''ارجنسی'' (urgency) سے مشابہ قرار دینا از حد خیال افروز ہے اور شاید اسے وہ نوجوان نسل نہ سمجھ سکے جن کے لیے جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی (کمپیوٹر) کے ذریعے برقی میل کے بعد پرانے ڈاک کے نظام کا بہت کم تصور رہ گیا ہے۔ میں اس دور کا تجربہ رکھتا ہوں جب معمول کی روزمرہ ڈاک کے علاوہ کبھی کبھی عام اوقات سے ہٹ کر ڈاکیا تار (ٹیلی گرام) پہنچانے آتا تھا' تو پورے گھر کے افراد چوکنے ہو جاتے تھے اور ایک طرح کی کھلبلی مچ جاتی تھی۔ ٹیلی گرام میں اہم خبر کے ساتھ ساتھ فوری اور بلا تاخیر عمل کا تقاضا بھی عموماً ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں پہلو قرآن کی جملہ تعلیمات کے ضمن میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ مثلاً آیت ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (آل عمران:۱۳۳) ''دوڑو' لپکو اپنے رب کی مغفرت کی طرف'' ان الفاظ میں موجود آہنگِ معنویت بتا رہا ہے کہ ہمیں ایمان کے حصول اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے میں سرعت اور ارجنسی کے احساس کے ساتھ روبعمل ہونا چاہیے۔ تاخیر و تعویق اور مداہنت (complacency) کا رویہ ایسا ہے جس کی مذمت کی گئی ہے۔ اسی طرح حق کے واضح ہونے کے بعد اس کے تقاضوں کو عمل میں لانے میں تاخیر سے توفیق کے سلب ہونے کی وعید سنائی گئی ہے:

﴿وَنُقَلِّبُ اَفْـِٕدَتَهُمْ وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ (الانعام)

قرآن کریم کے جملہ مضامین کی ارجنسی اور دھماکہ خیزیت ہی کی طرف مولانا حالی مرحوم نے اپنے اس شعر میں تصویر لفظی کھینچی ہے:

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ھادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

اسی مضمون کو کئی احادیثِ نبویہ میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً ((خیر البر عاجله)) یعنی اچھی نیکی وہ ہے جس کو فوری اور بلا تاخیر عمل میں لایا جائے۔ ''ٹیلی گرام'' کا پیرایہ مزید برآں قیامت (الساعة) کے احوال کے بیان پر بھی صادق آتا ہے جو نہایت ہولناک اور اچانک و دفعۃً شروع ہو جائیں گے۔ یعنی ہمیں قیامت اور اس دنیا کے خاتمے کی urgency کا خیال ہر لمحے رہنا چاہیے' اور ایک حدیث رسول ﷺ کے مطابق کسی فرد کی موت اس کے لیے قیامت کے درجے میں ہے کہ اس سے اس کے لیے مہلتِ عمل ختم ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ دارِ عمل سے دارِ جزا کی جانب بڑھتا ہے۔ الغرض ایک فرد کی موت کسی لمحے (علم الٰہی کے مطابق) اس کو آ دبوچے' ہمیں اس سے پہلے زندگی اور صحت کی ساعات کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔

دوسری جانب نیکی کے عمل میں محمود سرعت و عجلت کے مقابلے میں نتائج اعمال اور دینی جِدّوجہد بالخصوص

☆ *Shabbir Akhtar, The Quran and the Secular Mind, Routledge, London and New Yark, 2010.*

اقامتِ دین کی مساعی کے سلسلے میں ٹھوس نتائج کاملۃً اللہ تعالیٰ کی مشیت پر چھوڑ دینے کی تعلیم ہے‘ یعنی ہمارا سوچا سمجھا ذہنی رویّہ یہ ہونا چاہیے کہ ہم عمل اور سعی و جُہد کے مکلّف ہیں اور نتائج اس کی مرضی و مشیّت پر منحصر ہیں۔ **السّعی مِنّا و الاتمام من اللّٰہ**۔ چنانچہ نتیجہ خیزی میں عجلت پسندی کی بجائے دینی فرائض کے ضمن میں پیہم عمل‘ مستقل مزاجی‘ مداومت (خواہ‘ مقدار کم ہو) اور صبر کی تعلیم دی گئی ہے‘ اور عمل میں انہیں مستقل اپنانا مطلوب و مقصود ہے۔ محولہ بالا انگریزی جملے کے ابتدائی حصے کا مفہوم بھی نہایت اہم ہے‘ یعنی شارع کی حیثیت میں اللہ جو چاہے حکم دے سکتا ہے اور قانون وضع کر سکتا ہے۔ وہ اپنی اتھارٹی اور حاکمیت میں بلاشرکتِ غیرے مطلق ہے۔ چنانچہ قوانینِ شرعیہ کے بیان میں ہمیں دوٹوک اور انتہائی تحکمانہ انداز نظر آتا ہے‘ مثلاً جیسے فرمایا: ﴿وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵) اقتدار و اختیار کا سرچشمہ صرف اُسی کی ذاتِ اقدس ہے۔

راقم الحروف نے سامعین کی اسلامی تعلیمات اور دین اسلام کے پورے تانے بانے میں اجتماعی انصاف اور عدل و قسط کے نظام کی اہمیت کے حوالے سے توجہ مبذول کروائی۔ سوشل جسٹس اور ایکوئٹی کے تصورات بین الانسانی سطح پر عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے عصر حاضر کی مقبول ترین فلسفیانہ فکر — انسانیت دوستی (humanism) — کے بہت قریب آ جاتے ہیں۔ قرآنی آیات اور بعض مستند اور قوی احادیثِ رسولؐ کا مدعا بھی یہی نظر آتا ہے۔ اسلام کی تعلیمات کو ایک وسیع تناظر میں رکھ کر دیکھا جائے تو ان کا منشا ایک مردِ مؤمن کے اعتبار سے بھی God-centred humanism نظر آتا ہے‘ یعنی ایک ایسا نظریہ جس میں خالق و معبود سے رشتۂ توحید کے بتمام و کمال تقاضوں کے ساتھ اور انسانیت کی سطح پر لوگوں سے ہمدردی اور ان کے حقوق کی ادائیگی مرکزی اہمیت کے حامل ہوں۔ یہاں میں ایک حدیث کے حوالے سے بھی اس خیال کو مزید مؤکد کر سکتا ہوں جس میں ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے دین کی حقیقت کے بارے میں سوال کیا۔ جواباً آپؐ نے اسے دو عناصر کے ذکر سے واضح کیا۔ اوّلاً حنیفیت اور ثانیاً سماحت۔ اوّل الذکر کا مطلب خدا پر ایمان‘ یقین و بھروسہ پوری یکسوئی کے ساتھ ہے‘ جو شک و شبہ کی ہر کھٹک سے بالاتر ہو۔ اللہ تعالیٰ اور اس کی توحید کے بارے میں اس مقدس روایت کو قائم کرنے والے وہ ہزاروں پیغمبر‘ حکماء اور عارف ہیں جنہوں نے خالقِ برحق سے براہِ راست یہ روشنی پائی‘ جنہوں نے اپنے وجدان و ضمیر کی سطح پر ان نقوش کا مطالعہ کیا اور کائنات کے نظم و ترتیب اور حسن و دل آویزی میں اس کے جمالِ جہاں تاب کی جھلک پائی۔ حضرات انبیاء و رسل میں حنیفیت (God centredness) کی شان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ بابرکت میں نمایاں ترین درجے میں نظر آتی ہے۔ مؤخر الذکر یعنی سماحت (magnanimity) فیاضی‘ عالی ظرفی‘ برداشت‘ دل کی کشادگی اور رواداری کا مفہوم رکھتا ہے‘ جو کسی معاشرے میں انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کی فضا قائم کرنے کے لیے ضروری اوصاف ہیں۔ اور ایک اعتبار سے ان کا تعلق حقوق العباد سے بھی ہے جن کی تاکید ہمارے دین میں شدّ و مدّ کے ساتھ آئی ہے۔ چنانچہ دین اسلام میں اس طرح ہیومن ازم کے تمام تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں جن کے لیے ہمارے مغرب زدہ اور مغربی افکار سے متاثر لوگ نرم گوشہ رکھتے ہیں اور بزعم خویش ان کے علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

بانیٔ محترمؒ کا فکر اور پیغام

مرکزی انجمن خدام القرآن کے ۳۹ویں سالانہ اجلاس کے موقع پر
امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید ﷾ کا مختصر خطاب

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ

(آل عمران:۱۰۳)

مرکزی انجمن کا پچھلا سالانہ اجلاس چونکہ ایسا پہلا موقع تھا کہ صدر مؤسس اور بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ ہمارے درمیان موجود نہیں تھے‘ چنانچہ اس حوالے سے میں نے کچھ تاثرات کا اظہار کیا تھا اور ان کی خدمت قرآنی کے کچھ نکات آپ کے سامنے رکھے تھے‘ اور اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کے ساتھ انہیں جو خصوصی ذہنی اور قلبی لگاؤ عطا فرمایا تھا اس کے حوالے سے چند باتیں عرض کی تھیں۔ آج بھی ایک دو نکات پر اکتفا کروں گا۔ وہ ایک خادمِ قرآن‘ مدرّسِ قرآن اور داعیٔ قرآن ہی نہیں تھے‘ بلکہ حالاتِ حاضرہ کے حوالے سے پاکستان کے معروضی حالات‘ پوری اُمّتِ مسلمہ کے حالات‘ سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کی کشمکش‘ اس کا تاریخی پس منظر اور آئندہ آنے والے واقعات کے بارے میں جو راہنمائی ہمیں احادیث مبارکہ سے ملتی ہے اس پر بھی ان کی غیر معمولی نظر تھی اور اس ضمن میں بھی انہوں نے ہمیں غیر معمولی راہنمائی فراہم کی ہے۔ چنانچہ اس وقت پوری ملّتِ اسلامیہ کو بھی اور ہمارے پاکستان کو بھی جو حالات و واقعات پیش آ رہے ہیں‘ یہ کم از کم ان لوگوں کے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے جو محترم ڈاکٹر صاحب کے مسلسل اور مستقل سننے والے تھے۔ ہاں تشویش یہ ہے کہ جن خدشات کا اظہار وہ کرتے رہے ہیں وہ اب رونما ہو رہے ہیں۔ ان کے سامنے پوری پاکستانی قوم اور پوری ملتِ اسلامیہ جس رُخ پر جا رہی تھی‘ اس طرزِ عمل کے نتائج و عواقب کا جو تذکرہ وہ کرتے تھے‘ وہ ظاہر بات ہے کہ بڑے منفی اور سنگین تھے۔ اب وہ نتائج و عواقب سامنے آتے ہیں تو ایک صدمے اور رنج کی کیفیت کا ہونا تو ایک فطری بات ہے‘ لیکن اس پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے ان کی کتاب ’’سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی‘ حال اور مستقبل‘‘ بہت اہم ہے‘ جس کا انگریزی ترجمہ ’’Lessons from History‘‘ بھی بہت مقبول ہوا اور آج کل مغرب میں اس کی کافی ڈیمانڈ ہے۔ اس کا مطالعہ آپ لوگ ضرور کریں۔ محترم ڈاکٹر صاحب ایک طرف پوری شدت سے اس بات کے قائل تھے

اور پورے اِذعان سے یہ بات کہتے تھے کہ قیامت سے قبل کُل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا' لیکن دوسری طرف وہ ان حالات سے بھی متنبہ کرتے رہے ہیں جو اس سے پہلے پیش آنے والے ہیں اور اس امت کو اپنی بداعمالیوں اور اللہ کے دین سے بے وفائی کی جو سزا ملنے والی ہے' اور کن کے ہاتھوں ملنے والی ہے۔ یہ ساری چیزیں انہوں نے بڑے مربوط انداز میں قرآن وسنت اور خاص طور پر احادیث کے حوالے سے پیش کی ہیں اور اس ضمن میں انجیل کی پیشین گوئیوں کو بھی سامنے رکھتے ہوئے ہمیں راہنمائی دی ہے۔

اس وقت میں خاص طور پر پاکستان کے حوالے سے عرض کروں گا کہ اب جو صورتِ حال ہے وہ الفاظِ قرآنی: ﴿وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ (آل عمران:۱۰۳) کا مصداق ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ امریکہ اس وقت ہمارے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے۔ وہ ہمارے اداروں کو باہم لڑا رہا ہے اور اس حوالے سے کیسی کیسی سازشیں سامنے آ رہی ہیں۔ ہمیں کمزور کرنے کے لیے اس نے کیا کچھ نہیں کیا؟ اور ہم ہیں کہ اس کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلتے ہوئے اپنے آپ کو اندھے کنویں کے کنارے تک پہنچا دیا ہے۔ اب کچھ ہوش آئی ہے' کچھ کھڑے ہوئے ہیں' کچھ پریشانی کا اظہار ہوا ہے' ورنہ سب کو اپنے اپنے مفادات عزیز ہیں' نہ کسی کو دین کی پروا ہے نہ ملک کی' اور نہ ہی قومی مفادات کا کوئی خیال ہے۔ ہماری سیاسی قیادتیں ہوں یا دینی قیادتیں' سیکولر لیڈر ہوں یا مذہبی راہنما' ایک ہی ڈگر پر' تقریباً یکساں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھ رہے تھے۔ اب جو صورت حال درپیش ہے اس میں وہ اکٹھے بھی ہو رہے ہیں اور پریشانی بھی ہو رہی ہے۔ اس ملک کے اندر ہمارے حکمرانوں نے' سیاسی اور عسکری قیادتوں نے اپنے عوام کے ساتھ' اپنے ہی شہریوں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک کیا ہے وہ ناقابلِ فراموش ہے۔ اور پھر افغانستان کے معاملے میں ہم نے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جس طرح کفر کا ساتھ دیا' کوئی چھپ چھپا کر نہیں بلکہ صف اول کے اتحادی بن کر' اس سب کا نتیجہ اس وقت سامنے ہے اور اس سے سب لوگ کانپ رہے ہیں۔

میں آپ کو یاد کرواؤں گا کہ اس حوالے سے بانی محترمؒ نے چھ' سات سال قبل ایک خطاب فرمایا تھا کہ ''کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟''— یہ ملک اسلام کے نام پر بنا تھا' اور جب ہم اسلام ہی کی جڑیں کھود رہے ہیں تو کب تک قائم رہے گا؟ جب ہم خود اس کی بنیادوں پر تیشے چلا رہے ہیں تو اس کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ایک راستہ بھی وہ بتایا کرتے تھے کہ اگر ہم اللہ کے ساتھ اور دین کے ساتھ مخلص ہو جائیں' اپنے اجتماعی جرائم کا ازالہ کریں' اپنے رب کے دامن کو تھامیں' دین کے ساتھ وفاداری اختیار کریں تو اللہ کی رحمت و نصرت ہمارے ساتھ ہو گی۔ چونکہ اس وقت کے حالات میں ہر شخص کے ذہنوں میں سوالیہ نشان ہے اور ہر شخص صدمہ' رنج اور پریشانی محسوس کر رہا ہے' لہٰذا میں نے چاہا کہ آج اس محفل میں بانی محترمؒ کا فکر اور ان کا پیغام بھی آپ تک پہنچا دوں۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کی بھی حفاظت فرمائے اور پوری ملّتِ اسلامیہ کی بھی' اور اس قوم کو توفیق دے کہ یہ صحیح معنوں میں اللہ اور اُس کے دین کی وفادار بن جائے اور پاکستان جس مقصد کے لیے قائم ہوا تھا واقعتاً وہ مقصد پورا ہو۔ یہ اسلام کا ایک مضبوط قلعہ بنے اور پوری دنیا کے لیے ایک روشنی کا مینار ہو۔ یہ دورِ حاضر میں بِالقُوّۃ (potentially) ایک اسلامی فلاحی ریاست بن سکتا تھا' لیکن ہماری غفلتوں اور ہمارے جرائم کی وجہ سے ہم اپنی اس منزل سے بہت دور چلے گئے۔ اللہ کرے کہ پھر ہم اس منزل کی طرف آگے بڑھ سکیں۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ترتیب وتدوین: سید برہان علی۔ حافظ محمد زاہد

سُورَۂ قٓ

سورۂ قٓ تا سورۃ الواقعہ سات سورتیں ہیں اور یہ سب مکّی ہیں۔ مکّی سورتوں کا یہ گلدستہ ادب اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے قرآن حکیم کا حسین ترین مقام ہے۔ قرآن حکیم کئی اعتبارات سے معجزہ ہے‘ مثلاً علمی و فکری اعتبار سے‘ پیشین گوئیوں کے لحاظ سے‘ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے‘ وغیرہ۔ لیکن قرآن حکیم کا سب سے نمایاں اور اس کے اوّلین مخاطب یعنی اہلِ عرب پر سب سے زیادہ اثر انداز ہونے والا پہلو‘ ادبی اور فصاحت و بلاغت والا پہلو ہے۔ ادبیت اور فصاحت و بلاغت کے حوالے سے یہ سات سورتیں (قٓ سے الواقِعَة) قرآن حکیم کی معراج اور نقطۂ عروج ہیں۔ ان میں سے ایک سورۃ ’’الرحمٰن‘‘ ہے‘ جسے نبی کریم ﷺ نے ’’عُرُوسُ القرآن‘‘ (قرآن مجید کی دلہن) قرار دیا ہے۔

ان تمام سورتوں کا اہم ترین موضوع آخرت ہے۔ آخرت کے حالات اور اس کی نقشہ کشی کی تعبیر اگر ایک لفظ میں کی جائے تو وہ ہے ’’اِنذار‘‘ (خبردار کرنا) جو ان سورتوں کا مرکزی مضمون ہے۔ یوں تو مکی سورتوں میں ہر جگہ ’’ایمانیاتِ ثلاثہ‘‘ یعنی توحید‘ آخرت اور رسالت کی بحث ملے گی‘ لیکن ان سورتوں میں زیادہ نمایاں پہلو خبردار کرنے کے حوالہ سے ہے کہ وہ وقت آنے والا ہے جب تمہیں اپنے ربّ کے حضور حاضر ہونا ہوگا‘ اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی‘ جزا و سزا کے فیصلے صادر ہوں گے اور جنت و جہنم میں سے کسی ایک میں تمہیں داخل ہونا پڑے گا۔

ان سورتوں میں پہلی سورۂ قٓ ہے‘ جس کی ابتدائی آیات ہی اس کا عمود متعین کر رہی ہیں‘ جس میں بعث بعد الموت کا انکار کرنے والوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝

''ق۔ قسم ہے اس عظیم الشان قرآن کی (کہ آپؐ ہمارے بھیجے ہوئے پیغمبر ہیں)۔ مگر ان کو بڑا تعجب ہوا (اس بات پر کہ) ان کے پاس ایک خبردار کرنے والا آیا ہے' تو انکار کرنے والے کہنے لگے کہ یہ تو بہت حیران کن بات ہے۔ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے (تو ہمیں دوبارہ اٹھایا جائے گا)؟ یہ تو بہت دُور کی بات ہے۔''

آیت ۴' ۵ میں اللہ تعالیٰ نے منکرین کی اس بات کا جواب بایں الفاظ دیا:

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝

''تحقیق ہم خوب جانتے ہیں کہ زمین ان میں سے کیا کم کرتی ہے' اور ہمارے پاس وہ کتاب ہے جس میں ہر چیز محفوظ ہے۔ بلکہ انہوں نے حق کو جھٹلایا جب وہ ان کے پاس آ پہنچا' پس یہ اُلجھی ہوئی بات میں پھنسے ہوئے ہیں۔''

بعث بعد الموت کے منکرین کو ایک جواب اللہ تعالیٰ نے آیت ۱۵ میں دل میں اتر جانے والے انداز میں بایں الفاظ دیا:

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۝

''کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کرنے کے بعد اب عاجز آ گئے ہیں؟ (حالانکہ ہماری قدرت اور قوت کے خزانے میں تو کوئی کمی نہیں آئی) بلکہ یہ لوگ دوبارہ پیدا کیے جانے میں دھوکہ میں آ گئے ہیں۔''

آیات ۶ تا ۱۱ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیوں اور انعامات خصوصاً آسمان' زمین اور بارش کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''کیا اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس کو کیسے بنایا اور کیسے رونق دی کہ اس میں کوئی رخنہ تک نہیں؟ اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور ڈالے اس میں بوجھ (یعنی پہاڑ تاکہ یہ ہل نہ سکے) اور اُگائی اس میں ہر قسم کی رونق کی چیز۔ (یہ ساری چیزیں) آنکھیں کھولنے والی اور سبق دینے والی ہیں ہر (حق کی طرف) رجوع ہونے والے بندے کے لیے۔ اور اتارا ہم نے آسمان سے برکت والا پانی' پھر اُگائے ہم نے اس سے باغ اور فصلیں جو کاٹی جاتی ہیں اور (اسی سے اُگائے) بلند و بالا درخت کھجور کے جن کے خوشے تہہ در تہہ ہیں۔ یہ بندوں کے لیے رزق ہے' اور اس کے ذریعے ہم بنجر زمین کو قابل کاشت بناتے ہیں۔ اسی طرح تمہارا (مرنے کے بعد قیامت کے دن دوبارہ) نکلنا ہے۔'' (آیات ۶ تا ۱۱)

آیات ۱۶ سے ۲۳ تک اللہ تعالیٰ کے علم کا تذکرہ ہے جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ انسانی خیالات سے لے کر اس کے افعال تک ہر چیز اللہ کے علم میں ہے اور اللہ کے مقرر کردہ فرشتے انسان کے تمام اعمال اس کے اعمال نامہ میں لکھ رہے ہیں اور وہ قیامت کے دن اسے ہر چیز کی خبر دے گا۔ فرمایا:

''اور ہم ہی نے انسان کو پیدا کیا ہے اور ہم اس کے دل کے خیالات کو بھی جانتے ہیں' اور ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ جب (وہ کوئی کام کرتا ہے تو) وہ لکھنے والے جو دائیں بائیں بیٹھتے ہیں' لکھ لیتے ہیں۔ کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس (لکھنے کو) تیار رہتا ہے.....

(قیامت کے دن) ہر شخص (ہمارے سامنے) اس حالت میں حاضر ہوگا کہ اُس کے ساتھ ایک (فرشتہ) ہانک کر لانے والا ہوگا اور ایک (اس کے اچھے بُرے اعمال کی) گواہی دینے والا ہوگا..... اور اس کا ہم نشین (فرشتہ) کہے گا کہ یہ (اعمال نامہ) میرے پاس حاضر ہے!'' (آیات ۱۶ تا ۲۳)

اس سورۃ کی آیت ۳۹، ۴۰ میں پانچ نمازوں کے اوقات کا تذکرہ موجود ہے، فرمایا:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝

''(اے نبی ﷺ!) جو کچھ یہ (کفار) بکتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح بیان کیجیے آفتاب کے طلوع ہونے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے۔ اور رات کے اوقات میں پھر اس کی تسبیح کیا کریں اور نمازوں کے بعد بھی۔''

بعض روایات کے مطابق آپ ﷺ پر ابتدا میں صرف تین نمازیں فرض تھیں، جن کا ان آیات میں ذکر ہے، یعنی فجر، عصر اور تہجد۔ جبکہ بعض کے مطابق ان آیات میں پانچوں نمازوں کا تذکرہ ہے۔ ''قبل طلوعِ الشمس'' سے مراد فجر ''قبل الغروب'' سے مراد ظہر و عصر اور ''من اللیل'' سے مراد مغرب اور عشاء ہے۔

سُورۃُ الذّٰریٰت

یہ سورۃ چھوٹی چھوٹی ۶۰ آیات پر مشتمل ہے۔ اس کی ابتدائی آیات میں چار مختلف قسم کی ہواؤں کی قسمیں کھائی گئی ہیں اور ان کے بعد فرمایا:

اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ۝

''بے شک جو وعدہ تم سے کیا گیا ہے وہ سچا ہے، اور جزا و سزا ضرور واقع ہو کر رہے گی۔''

یہی وہ بنیادی خبر ہے جو ان ساتوں سورتوں (سورۂ ق تا سورۃ الواقعہ) کا بنیادی موضوع ہے۔

آیات ۱۵ تا ۱۹ میں متقین کی صفات اور ان کے اجر کا بیان کیا ہے جو ان کو قیامت کے دن ملے گا۔ فرمایا:

''بے شک اللہ سے ڈرنے والے (اس دن) باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ لے رہے ہوں گے جو ان کا رب انہیں دے رہا ہوگا۔ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بھی نیکوکار تھے۔ یہ لوگ رات کو (عبادتِ ربّ کی وجہ سے) بہت کم سویا کرتے تھے اور سحری کے وقت استغفار کرتے تھے۔ اور ان کے اموال میں حق تھا مانگنے والوں اور محروموں کا۔'' (آیات ۱۵ تا ۱۹)

آیات ۲۴ سے ۳۷ تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک واقعہ کا تذکرہ ہے کہ جب ان کے پاس فرشتے انسانی شکل میں بیٹے کی بشارت لے کر آئے تو آپؑ ان کی ضیافت کے لیے موٹا تازہ بچھڑا بھون کر لے آئے، مگر انہوں نے نہ کھایا۔ آپؑ نے فرمایا:

''تم کھاتے کیوں نہیں؟ اور آپؑ دل میں ان سے خوف کرنے لگے۔ وہ بولے: ڈریے نہیں، اور انہوں نے بشارت دی آپ کو ایک صاحبِ علم بیٹے کی۔ پس آپؑ کی بیوی متعجب ہو کر آئیں اور اپنے منہ پر (تعجب

کے باعث) طمانچہ دے مارا اور کہنے لگیں: میں بوڑھی اور بانجھ ہوں (میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا؟) انہوں نے کہا: ایسا ہی کہا ہے تیرے ربّ نے' بے شک وہ بہت حکمت والا اور جاننے والا ہے۔'' (آیات ۲۷ تا ۳۰)

اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اِن فرشتوں سے اُن کے آنے کا مقصد دریافت فرمایا تو انہوں نے بتایا کہ انہیں ایک مجرم قوم (قومِ لوطؑ) کی تباہی کے لیے بھیجا گیا ہے۔

اس کے بعد آیات ۳۸ تا ۴۶ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام' قومِ عاد' قومِ ثمود اور قومِ نوحؑ کا اجمالاً تذکرہ ہے۔

تیسرے رکوع کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے حیاتِ اُخروی کے ثبوت کی ایک اور دلیل دیتے ہوئے فرمایا:

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۹﴾

''اور آسمان کو ہم نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے اور بے شک ہم بڑی وسیع قدرت رکھتے ہیں۔ اور اس زمین کو ہم ہی نے بچھایا ہے سو کیا خوب بچھانا جانتے ہیں ہم۔ اور ہر شے کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں تاکہ تم نصیحت پکڑو۔''

اگر تمہیں نباتات و حیوانات میں جوڑے نظر آ رہے ہیں تو اسی طرح بلندی و پستی ہے اور زمین و آسمان ہے۔ ان کو بھی آپ جوڑوں کی شکل میں سمجھ سکتے ہیں کہ آسمان سے بارش برستی ہے تو زمین سے روئیدگی برآمد ہوتی ہے۔ اسی طرح حیاتِ دنیوی کا بھی ایک جوڑا ہے اور وہ ہے حیاتِ اُخروی۔ یہ بھی حیاتِ اُخروی کے اثبات کی ایک دلیل ہے کہ جب ہر شے کا ایک جوڑا ہے تو اسی طرح زندگی بھی ایک نہیں ہو سکتی' لازماً اس کا بھی جوڑا ہوگا۔ اگر اس کا بھی جوڑا نہ ہو تو پھر اس کی تخلیق ہی بے معنی رہے گی کہ نہ کسی کو نیکی کی جزا ملے اور نہ بدی کی سزا۔

ایک نہایت اہم آیت اس سورۂ مبارکہ میں آئی ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

''اور میں نے جنّوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

بعض مفسّرین کے نزدیک ''اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ'' یہاں ''اِلَّا لِيَعْرِفُوْنِ'' کے معنی میں ہے۔ یعنی ''میں نے جنّوں اور انسانوں کو اپنی پہچان اور معرفت کے لیے پیدا کیا ہے۔''

سُورۃُ الطُّور

یہ سورۃ ۲ رکوع اور ۴۹ آیات پر مشتمل ہے۔ پچھلی سورۃ کی طرح اس سورۃ کی ابتدا بھی قسموں سے ہوئی ہے۔ ابتدائی چھ آیات میں پانچ اشیاء کی قسم کھائی گئی ہے۔ فرمایا:

وَالطُّوْرِ ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ﴿۶﴾

''قسم ہے طور (پہاڑ) کی' اور لکھی ہوئی کتاب کی' جس کے صفحات کشادہ ہیں' اور آباد گھر کی' اور اونچی

چھت کی' اور اُبلتے ہوئے دریا کی۔''

اگلی آیات میں مُقسَم علیہ یعنی جس چیز کے لیے قسم کھائی جا رہی ہے' کا بیان ہے اور وہی ان سورتوں کا بنیادی موضوع ہے۔ فرمایا:

اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۙ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ

''بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہونے والا ہے' اس کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ جس دن کہ آسمان کپکپا کر لرزے گا' اور پہاڑ چلنے لگیں گے۔ سو اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ہلاکت ہے۔''

منکرین اور کافرین کے انجام کا تذکرہ آیت ۱۶ تک چلتا ہے۔ اس کے بعد آیت ۱۷ سے ۲۸ تک متقین کے انجام اور ان انعامات کا تذکرہ ہے جو متقین کو قیامت کے دن ملیں گے۔ مثلاً وہ باغات میں ہوں گے' ان کے لیے ہر طرح کے میوے اور شراب وطعام ہوگا' بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی اور ایسی پاکیزہ شراب ہوگی کہ جس کے پینے سے انسان حواس باختہ نہیں ہوگا (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُمْ)۔ ان انعامات میں ایک انعام یہ بھی ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی اولاد بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہی تو ہم (جنت میں) ان کی اولاد کو ان کے ساتھ ملا دیں گے (چاہے ان کا رتبہ ان سے کچھ کم ہی ہو) اور (اس کے بدلے میں) ہم اُن (جنتیوں) کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہیں کریں گے۔ (یاد رکھو) ہر آدمی اپنی کمائی کا ذمہ دار ہے۔''

دوسرے رکوع کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے نبی اکرم ﷺ کی ذات پر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ۝

''(اے نبی ﷺ!) آپ یاد دہانی کراتے رہیں' آپ اپنے رب کے فضل سے نہ کاہن ہیں اور نہ مجنون۔ کیا ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ آپ تو ایک شاعر ہیں اور ہم منتظر ہیں گردشِ زمانہ کے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ بھی کہہ دیجیے: (ضرور) انتظار کرو پس میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔''

اگلی آیات میں کفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝

''کیا واقعتاً ان کی عقلیں انہیں یہی رائے دے رہی ہیں یا یہ اُن کے مزاج کی سرکشی اور تکبّر ہے (جو اُن سے ایسی باتیں کہلوا رہا ہے)؟ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ (قرآن) خود پیغمبرؐ نے گھڑ لیا ہے؟ درحقیقت یہ

بے ایمان ہیں۔ اگر یہ سچے ہیں (اس بات میں کہ یہ قرآن محمد ﷺ کی تصنیف ہے) تو یہ بھی بنا لائیں ایسا ہی کلام!''

قرآن حکیم عام طور پر فطری استدلال کا راستہ اختیار کرتا ہے' لیکن کہیں کہیں اپنے استدلال میں فلسفہ اور منطق کو بھی اختیار کرتا ہے۔ جیسے فرمایا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝

''کیا یہ بغیر کسی پیدا کیے کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود اپنے آپ کو پیدا کرنے والے ہیں؟''

ظاہر بات ہے کہ یہ محالِ عقلی ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ میں اپنے آپ کو پیدا کرنے والا نہیں ہوں' تو لازماً میرا کوئی خالق ہے جس نے مجھے وجود بخشا ہے۔

اس سورۃ کے آخر میں فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۝

''(اے نبی ﷺ!) آپ صبر کیجیے اپنے رب کے حکم کے ساتھ' بے شک آپ ہماری نگاہوں میں ہیں اور اپنے ربّ کی تسبیح بیان کریں اس کی حمد کے ساتھ جب آپ (سو کر) کھڑے ہوتے ہیں۔ اور رات کو بھی اللہ کی تسبیح بیان کریں اور (اس وقت) جب ستارے پیٹھ دکھا رہے ہوں۔''

سُورۃُ النَّجْم

یہ سورۃ چھوٹی چھوٹی ۶۲ آیات پر مشتمل ہے۔ پچھلی دو سورتوں کی ابتدائی آیات کی طرح اس کی پہلی آیت میں بھی ستارے کی قسم کھائی گئی ہے۔ فرمایا: ﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝۱﴾ ''قسم ہے ستارے کی جب وہ گرے۔''

اس سورۃ کی ابتدائی آیات نہایت اہم اور مشکلات القرآن میں سے ہیں جن پر بڑی علمی بحثیں ہوئی ہیں۔ ان میں رسول اللہ ﷺ کے معراج واقعہ کے دوسرے یعنی آسمانی حصہ کا تفصیلاً ذکر ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا۔ ستارے کی قسم کے بعد آگے ارشاد ہوا:

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۝

''تمہارے صاحب (محمد ﷺ) نہ تو گمراہ ہوئے ہیں اور نہ ہی غلط راستہ پر چلے ہیں۔ اور نہ ہی وہ اپنی ہوائے نفس کی بنا پر کچھ کہتے ہیں۔ یہ تو ایک وحی ہے جو ان پر (نازل) کی جاتی ہے۔ انہیں تعلیم دی ہے بڑی طاقت والے زور آور (جبرائیل) نے' جب وہ سیدھا بیٹھا۔'' (آیات ۲ تا ۶)

رسول اللہ ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو دو مرتبہ ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہے۔ پہلی مرتبہ افق پر اور دوسری مرتبہ شب معراج میں سدرۃ المنتہیٰ کے قریب۔ اگلی آیات میں اس کا بیان ہے۔ فرمایا:

''(نبی اکرم ﷺ نے جبریل کو اصلی شکل میں پہلی دفعہ دیکھا) جب وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھے۔ پھر وہ قریب آئے اور لٹک گئے۔ پھر دو کمانوں جتنا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم۔ پھر اللہ نے وحی کی اپنے بندے کو جو وحی کی۔ جو کچھ (آنکھوں نے) دیکھا دل نے اس کو جھٹلایا نہیں۔ تو کیا تم جھگڑتے ہو ان سے اس پر جو انہوں نے دیکھا؟ اور البتہ تحقیق انہوں نے ان (حضرت جبرائیلؑ) کو ایک مرتبہ اور بھی دیکھا ہے' سدرۃ المنتہیٰ کے قریب' جس کے قریب جنت الماویٰ ہے۔ جب سدرۃ المنتہیٰ پر چھا رہا تھا جو چھا رہا تھا (یعنی تجلیاتِ ربانی کا نزول ہو رہا تھا)۔'' (آیات ۷ تا ۱۶)

یہ مضامین ایسے ہیں کہ ان کو کتنے ہی سادہ الفاظ میں بیان کیا جائے' ہماری عقل کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔ سدرۃ المنتہیٰ پر کیا کیفیات ہیں' تجلیاتِ ربانی کی کیا کیفیت ہے' یہ ہماری عقل کے ادراک سے باہر ہے۔ پھر کیا اندازِ بیان اختیار کیا گیا کہ جب سدرۃ المنتہیٰ کو ڈھانپے ہوئے تھا جو ڈھانپے ہوئے تھا۔ اب تم کیا سمجھو گے کہ کیا ڈھانپے ہوئے تھا؟ آگے فرمایا:

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

''ان کی نگاہ نہ کج ہوئی نہ حد سے بڑھی' اور انہوں نے اپنے ربّ کی عظیم نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔''

ایک طرف تو آپ ﷺ نے سدرۃ المنتہیٰ کو نظر جما کر دیکھا ہے اور دوسری جانب آپ ﷺ کی نگاہ میں ادب بھی ہے کہ وہ حد سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے' لیکن اتنا تحمل بھی ہے کہ وہ چکا چوند نہیں ہو رہی ہے۔

آیات ۱۹ اور ۲۰ میں کفار کے تین بتوں کا ذکر ہے جن کو وہ سب سے زیادہ قابلِ احترام سمجھتے تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مشرکین سے خطاب کیا جا رہا ہے:

اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ۝

''بھلا تم نے لات اور عزیٰ پر بھی نظر کی ہے؟ اور وہ جو تیسری (دیوی) منات ہے؟''

مشرکین ان بتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اگلی آیات میں ان کے اس تصور کی نفی کرتے ہوئے فرمایا:

''کیا تمہارے لیے بیٹے اور اس کے لیے بیٹیاں ہیں؟ یہ تو بہت غلط تقسیم ہے۔ یہ تو بس ایک قسم کے نام ہی ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء واجداد نے رکھ لیے ہیں اور اللہ نے اس معاملے میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ محض اپنے گمان اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کو ان کے رب کی طرف سے ہدایت پہنچ چکی ہے۔'' (آیات ۲۱ تا ۲۳)

آیات ۲۷ اور ۲۸ بھی اسی موضوع سے متعلق ہیں کہ کفارِ مکہ فرشتوں کو بھی اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ اللہ نے اس کو بھی گمان کی پیروی قرار دیا۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـــًٔا ۝

''جو لوگ آخرت کا یقین نہیں رکھتے وہ ان فرشتوں کے عورتوں والے نام رکھتے ہیں' حالانکہ ان کے پاس

اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔ یہ محض اپنے گمان کی پیروی کرتے ہیں' اور حق بات کے مقابلے میں گمان کچھ کام نہیں آئے گا۔''

آیات ۴۲ تا ۴۵ میں اللہ تعالیٰ نے یہ واضح فرما دیا کہ اس عالَمِ اَرضی میں جتنے بھی متقابل اور متضاد احوال ہیں وہ سب میں نے ہی پیدا کیے ہیں۔ فرمایا:

وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝

''اور یقیناً (ہر ایک کو) تیرے رب تک پہنچنا ہے۔ یقیناً وہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا ہے' وہی مارتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے' اور وہی ہے جس نے ہر چیز کا جوڑا بنایا نر اور مادہ کی صورت میں۔''

سُورۃُ القَمر

اس سورۃ کی ابتدائی آیت میں ''شق القمر'' کے واقعہ کا ذکر ہوا ہے جس کو عام طور پر رسول اللہ ﷺ کے معجزات میں شمار کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معجزہ وہ ہوتا ہے جو تحدّی (challenge) کے ساتھ پیش کیا جائے' اور حضور ﷺ کا معجزہ صرف ایک ہے اور وہ ہے قرآن مجید۔ جبکہ خرقِ عادت یعنی عام طبعی یا فطری قوانین سے ہٹ کر واقعات رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بے شمار ہوئے ہیں۔ شق القمر بھی ایک خرقِ عادت واقعہ تھا' جس کی تفاصیل بڑی مختلف ہیں' لیکن خلاصہ یہ کہ چاند کے دو ٹکڑے ہو گئے اور اُس کے بعد وہ دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے۔

ابتدائی آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اگلی دو آیات میں اس جیسے واقعات پر کفار کے عمومی رویّے کو بیان کیا گیا ہے:

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ۭ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝

''قیامت قریب آ پہنچی اور چاند شق ہو گیا۔ اور اگر کافر کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ اور انہوں نے جھٹلایا اور اپنی خواہشات کی پیروی کی' اور ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔''

اس سورۂ مبارکہ میں آیات ۹ تا ۱۷ میں قومِ نوح کا' آیات ۱۸ تا ۲۲ میں قومِ عاد کا' آیات ۲۳ تا ۳۲ میں قومِ ثمود کا اور آیات ۳۳ تا ۴۰ میں قومِ لوط کا مختصراً مگر جامع انداز میں تذکرہ ہے۔ ان واقعات میں ایک چیز مشترک اور اہم ہے کہ ان میں سے ہر واقعہ کا اختتام ایک ہی آیت پر ہو رہا ہے اور وہ آیت ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ''اور ہم نے قرآن کو یاد دہانی کے لیے آسان کر دیا ہے' تو ہے کوئی اس سے نصیحت یا ہدایت کا طالب؟'' —— یہ قرآن مجید کا ایک چیلنج ہے اور اتمامِ حجت کے طور پر کہا جا رہا ہے کہ اگرچہ قرآن اپنے علمی پہلوؤں کے اعتبار سے بہت غامض ہے اور اپنے اندر ایسی گہرائیاں لیے ہوئے بھی ہے

کہ جن کی تہہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا' لیکن دوسری جانب یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کے لیے اصل ہدایت اور رہنمائی اس کی سطح پر ہی موجود ہے' جس کے لیے بہت زیادہ محنت و مشقت کی ضرورت نہیں ہے۔ نصیحت اور ہدایت کے پہلو سے قرآن آسان ہے' جس کو ''تذکّر'' کہا جاتا ہے' البتہ اس کی علمی' فکری اور عقلی گہرائیوں میں جانا انتہائی محنت و مشقت کے بغیر ممکن نہیں ہے' جس کو ''تدبّر'' کہا جاتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کی آیات ۴۳ تا ۴۵ میں ایک طرح کی پیشین گوئی آئی ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جتنے بھی مخالفین ہیں یہ سب پیٹھ دکھا دیں گے اور ان سب کو شکست ہو جائے گی۔ فرمایا:

اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾

''کیا تمہارے کافر ان لوگوں سے بہتر ہیں یا تمہارے لیے (پہلی) کتابوں میں فارغ خطی لکھ دی گئی ہے؟ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری جماعت بڑی مضبوط ہے؟ عنقریب یہ جماعت شکست کھائے گی اور یہ لوگ پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگ جائیں گے۔''

چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ غزوۂ بدر کے آغاز سے قبل رات کو رسول اللہ ﷺ نے طویل ترین سجدہ کیا۔ اس کے بعد جب سر اٹھایا تو آپؐ کی زبان مبارک پر یہی آیت تھی: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾﴾ معلوم ہوا کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اپنے وعدہ کی توثیق فرمائی۔

سُورۃُ الرَّحمٰن

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ سورۂ قٓ سے سورۃ الواقعہ تک' مکی سورتوں کا گلدستہ عبارت کے حسن' ادب اور فصاحت و بلاغت کے پہلو سے قرآن مجید کا حسین ترین مقام ہے' اور پھر ان میں سے بھی سورۃ الرحمٰن کو اس حوالے سے قرآن مجید کا نقطۂ عروج کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اس کو ''عروس القرآن'' قرار دیا ہے۔ اس سورۃ میں سے علیحدہ سے کوئی مضامین نکال کر لے آنا ممکن نہیں ہے' البتہ اس کی ابتدائی چار آیات میں چار چیزوں کا تذکرہ ہے' جو اپنی اپنی جگہ پر چوٹی کی ہیں۔ فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ﴿۴﴾

''(اللہ جو) نہایت مہربان (ہے)' اُسی نے قرآن کی تعلیم دی۔ اُسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اُسی نے اس کو بیان کرنا سکھایا۔''

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے چوٹی کے نام ''الرحمٰن'' کا ذکر ہے۔ دوسری آیت میں افضل ترین علم کا ذکر ہے جو اس نے اپنی مخلوق کو دیا ہے اور وہ چوٹی کا علم ہے ''قرآن''۔ تیسری آیت میں مخلوقات میں سے چوٹی کی مخلوق ''انسان'' کا تذکرہ ہے' جس کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ چوتھی آیت میں انسان کو ودیعت کی گئی صلاحیتوں میں سے چوٹی کی صلاحیت ''بیان'' کا ذکر ہے۔ انسانی دماغ میں کلام اور بیان

کا جو علاقہ ہے وہ سب سے زیادہ developed ہے۔ اب ان چار آیات کو جمع کیا جائے تو ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی قوتِ بیانیہ کا بہترین مصرف قرآن کو بیان کرنا ہے۔ اور یہ وہی بات ہے جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق نبی آخر الزمان ﷺ نے فرمائی: ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور اسے (دوسروں کو) سکھائیں۔''

اس سورۃ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ان تمام روحانی' جسمانی' دنیوی اور اُخروی نعمتوں کا ذکر تفصیل سے کیا ہے جن سے جنّوں اور انسانوں کو سرفراز کیا گیا' کیا جا رہا ہے یا کیا جائے گا — ہر نعمت کو ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝﴾ ''تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!'' مذکورہ جملہ اس سورۃ میں ۳۱ مرتبہ آیا ہے' اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے ایک روایت نقل کی ہے' وہ فرماتے ہیں:

''ایک دفعہ رسول کریم ﷺ نے ہمارے سامنے پوری سورۃ الرحمٰن کی تلاوت فرمائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خاموش رہے تو آپؐ نے فرمایا: ''میں نے یہ سورۃ ایک رات جنّوں کو سنائی تھی' وہ اس کا تم سے بہتر جواب دے رہے تھے۔ جب بھی میں یہ آیت پڑھتا: ﴿فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۝﴾ تو وہ جواب میں کہتے: لَا بِشَيْءٍ مِنْ نِعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ ''اے ہمارے ربّ! ہم تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے' پس تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔''

ہمارے لیے بھی ضروری ہے کہ ہم بھی جب اس آیت کو پڑھیں یا سنیں تو یہی جواب دیں۔

آیت ۴۶ سے سورۃ کے آخر تک ان نعمتوں کا ذکر ہے جو آخرت میں متقی اور نیک انسانوں اور جنّوں کو عطا کی جائیں گی۔ فرمایا:

''اور ہر اس شخص کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیش ہونے کا خوف رکھتا ہے' دو باغ ہیں..... ہری بھری ڈالیوں سے بھرپور..... ان باغوں میں دو رواں چشمے ہیں..... ان باغوں میں ہر پھل کی دو قسمیں ہیں..... (جنتی لوگ) ایسے فرشوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے جن کے استر ریشم کے ہوں گے اور باغوں کی ڈالیاں (پھلوں سے) جھکی ہوں گی..... ان کے درمیان شرمیلی نگاہوں والیاں ہوں گی جن کو ان سے پہلے کسی جن اور انسان نے نہیں دیکھا ہوگا..... ایسی خوبصورت جیسے ہیرے موتی..... ان باغات میں پھل' کھجوریں اور انار ہوں گے..... ان میں خوبصورت اور خوب سیرت بیویاں ہوں گی..... خیموں میں ٹھہرائی ہوئی حوریں ہوں گی..... وہ جنتی سبز قالینوں اور نادر فرشوں پر تکیے لگائے بیٹھے ہوں گے۔ تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ بڑی برکت والا ہے تیرے رب جلیل و کریم کا نام۔'' (آیات ۴۶ تا ۷۸)

سُورۃُ الوَاقِعَۃ

سورۂ ق سے جو سات مکی سورتوں کا گلدستہ شروع ہوا وہ سورۃ الواقعہ پر آ کر اختتام پذیر ہو رہا ہے۔ ان تمام سورتوں کا اہم ترین موضوع قیامت ہے اور اس سورۃ کی ابتدا بھی اسی سے ہو رہی ہے۔ فرمایا:

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝۱ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝۲

''جب وہ واقعہ ظہور پذیر ہوگا' تو پھر اس کا جھٹلانے والا کوئی نہ ہوگا۔''

آج تو یہ جھٹلا رہے ہیں کہ کیسے ممکن ہے' کیونکر ہوگا' کب ہوگا' وغیرہ وغیرہ' لیکن جب یہ وقوع پذیر ہوگا تو اس وقت یہ دنگ رہ جائیں گے اور ان کی زبانیں گنگ ہو کر رہ جائیں گی۔

آیت ۳ میں قیامت کے ایک پہلو کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۝۳﴾ ''(اور یہ واقعہ) کچھ کو نیچے گرا دے گا اور کچھ کو اونچا کر دے گا''۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ اِس دنیا میں اُس دن سے غافل ہو کر بڑی شان و شوکت اور عیش و عشرت میں زندگیاں بسر کر رہے ہیں اُس روز وہ پستیوں میں گرنے والے ہیں' جبکہ دوسری جانب وہ لوگ جو اپنے رب کی اطاعت و فرمانبرداری میں درویشانہ زندگی گزار رہے ہیں' جن کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایسے لوگ ہیں کہ کہیں رشتے کا پیغام بھیجیں تو کوئی ان سے رشتہ کرنا پسند نہ کرے' وہ کسی کی سفارش کرنا چاہیں تو کوئی ان کی بات نہ سنے اور یہ لوگ کسی محفل میں جگہ نہ پا سکیں' لیکن اللہ کے ہاں ان کا مقام یہ ہے کہ اگر کسی معاملہ میں بھولے سے قسم کھا بیٹھیں تو اللہ ان کی قسم کی لاج رکھے گا۔ قیامت کے روز اللہ کے ہاں ایسے لوگ بلند مراتب پر فائز ہوں گے۔

اس سورۂ مبارکہ میں قیامت کے دن تمام انسانوں کے تین گروہوں میں منقسم ہو جانے کا ذکر ہے۔ ویسے تو اجمالی طور پر سورۃ الرحمٰن میں بھی اس کا ذکر آیا ہے' لیکن اس سورۃ میں اس کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

وَكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۝۷ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۝۸ وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ۝۹ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۝۱۰

''(جب قیامت واقع ہوگی) اور تم (بنی نوعِ انسان) تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے: (۱) داہنی طرف والے' کیا خوب ہیں داہنی طرف والے (۲) بائیں طرف والے' کیا ہی برے ہیں بائیں طرف والے (۳) سبقت لے جانے والے' (کیا ہی خوب ہیں) سبقت لے جانے والے۔''

جو کامیاب ہونے والے لوگ ہوں گے وہ بھی دو جماعتوں میں منقسم ہوں گے: ایک ''السّابقون'' ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین کے معاملہ میں بھی سبقت کی' یعنی ایمان لانے میں پہل کی اور پھر اس کے لیے جان و مال قربان کرنے میں بھی آگے نکل گئے' ان کے بارے میں فرمایا گیا:

''یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے قریب ترین ہوں گے' نعمت کے باغات میں۔ ان میں پہلوں میں سے زیادہ اور بعد والوں میں سے کم لوگ شامل ہوں گے۔ ان پلنگوں پر جو سونے کی تاروں سے بنے ہوں گے' تکیہ لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ گھومتے پھرتے ہوں گے ان (کی خدمت) کے لیے نوجوان لڑکے جو ہمیشہ ایک سے رہیں گے۔ (ان کے ہاتھوں میں) پیالے' آفتابے اور جام ہوں گے شرابِ طہور کے' جس سے نہ وہ سر درد محسوس کریں گے اور نہ مدہوش ہوں گے۔ اور میوے ہوں گے جو وہ پسند کریں گے۔ اور اڑتے پرندوں کا گوشت ہوگا جس کی وہ رغبت کریں گے۔ اور خوبصورت آنکھوں والی حوریں

ہوں گی' ایسے موتیوں کی مانند جو غلافوں میں چھپے ہوئے ہوں۔ یہ بدلہ ہے ان اعمال کا جو وہ کرتے رہے تھے۔'' (آیات ۱۱ تا ۲۴)

اہلِ جنّت کا ایک دوسرا گروہ ''اصحابُ الیمین'' بھی ہوگا' جو ''السابقون'' سے درجے میں کم ہوں گے ان کے بارے میں فرمایا:

''وہ (مزے کر رہے) ہوں گے بے خار بیریوں میں' اور کیلے کے گچھوں میں' اور لمبے سایوں میں' اور پانی کے آبشاروں میں' اور پھلوں کی بہتات میں' کہ نہ وہ ختم ہوں گے اور نہ ان سے روکا جائے گا' اور اونچے (پلنگوں پر بچھے ہوئے) بستروں میں۔ ہم نے پیدا کیا ہے ان (کی بیویوں) کو اچھی اٹھان پر' پس ہم نے ان کو کنواریاں' پیار کرنے والیاں اور ہم عمر بنایا۔ (یہ سب نعمتیں ہیں) اصحابِ یمین کے لیے۔ (ان میں شامل ہوں گے) ایک بڑی جماعت پہلوں میں سے اور ایک بڑی جماعت بعد والوں میں سے۔'' (آیات ۲۷ تا ۴۰)

تیسرا گروہ ''اصحابُ الشّمال'' یعنی جہنم والوں کا ہے۔ ان کے برے انجام کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''(اصحاب الشمال) جھلستی لو اور کھولتے ہوئے پانی' اور سیاہ دھوئیں کے سائے میں ہوں گے' نہ یہ ٹھنڈا ہوگا اور نہ آرام دہ..... ان کو کھانا پڑے گا زقوم کے درخت سے (اور ان سے کہا جائے گا) تم بھرو اس سے اپنے پیٹ کو۔ پھر پینا پڑے گا اس پر کھولتا ہوا پانی (اور ان سے کہا جائے گا) پیو جیسے پیاسا اونٹ پیتا ہے۔ یہ ان کی مہمان نوازی ہوگی قیامت کے دن۔'' (آیات ۴۱ تا ۵۶)

اصحاب الشمال کے اس برے انجام کی وجوہات کا بھی تذکرہ کیا گیا کہ یہ لوگ قیامت کے قیام اور بعث بعد الموت کا نہ صرف انکار کرتے تھے بلکہ تضحیک بھی کرتے تھے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کی چند چیزوں کا تذکرہ کر کے لوگوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ ان چیزوں کو کس نے پیدا کیا اور یہ کس کی قدرت میں ہیں؟ فرمایا:

أَفَرَءَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ﴿٥٨﴾ ءَأَنتُمْ تَخْلُقُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلْخَٰلِقُونَ ﴿٥٩﴾

''بھلا دیکھو' جو پانی کا قطرہ (نطفہ) تم ٹپکاتے ہو۔ کیا تم اس سے (انسان بنا کر) پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرتے ہیں؟''

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ ﴿٦٤﴾

''بھلا دیکھو' جو تم بوتے ہو۔ کیا تم اس کو اُگاتے ہو یا ہم اُگاتے ہیں؟''

أَفَرَءَيْتُمُ ٱلْمَآءَ ٱلَّذِى تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ ءَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ ٱلْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾

''بھلا دیکھو' وہ پانی جو تم پیتے ہو' کیا تم نے اسے بادل سے اتارا ہے یا ہم ہیں اتارنے والے؟''

أَفَرَءَيْتُمُ ٱلنَّارَ ٱلَّتِى تُورُونَ ﴿٧١﴾ ءَأَنتُمْ أَنشَأْتُمْ شَجَرَتَهَآ أَمْ نَحْنُ ٱلْمُنشِـُٔونَ ﴿٧٢﴾

''بھلا دیکھو' وہ آگ جس کو تم سلگاتے ہو۔ کیا تم نے اس کا درخت پیدا کیا یا ہم ہیں پیدا کرنے والے؟''

(بقیہ صفحہ 55 پر)

ترجمۂ قرآن مجید
مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم
ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۃ النساء

آیات ۴۴ تا ۴۶

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ۝ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ۝ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

ط ع ن

طَعَنَ ۔ يَطْعَنُ (ف) طَعْنًا : کسی کو نیزہ چبھونا۔ طنز کرنا' طعنہ دینا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب : ''اُوْتُوْا'' کا نائب فاعل اس میں ''هُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''اَلَّذِيْنَ'' کے لیے ہے' جبکہ ''نَصِيْبًا'' مفعول ثانی ہے۔ ''كَفٰى بِاللّٰهِ'' میں با زائدہ ہے اور یہ آفاقی صداقت کا بیان ہے' اس لیے ترجمہ حال میں ہوگا۔ ''وَلِيًّا'' اور ''نَصِيْرًا'' تمیز ہیں۔ ''كَلِمَةٌ'' کی جمع ''كَلِمٌ'' ہے۔ ''غَيْرَ مُسْمَعٍ'' حال ہے' اس لیے اس کا مضاف ''غیر'' منصوب ہوا ہے۔ ''لَيًّا'' اور ''طَعْنًا'' بھی حال ہیں۔ ''اَقْوَمَ'' افعل تفضیل ہے اور ''كَانَ'' کی خبر ثانی ہے۔

ترجمہ:

اَلَمْ تَرَ : کیا آپؐ نے غور نہیں کیا
اِلَى الَّذِيْنَ : ان کی (حالت کی) طرف جن کو
اُوْتُوْا : دیا گیا
نَصِيْبًا : ایک حصہ

مِّنَ الْكِتٰبِ : کتاب سے
الضَّلٰلَةَ : گمراہی کو
اَنْ : کہ
السَّبِيْلَ : راستے سے
اَعْلَمُ : خوب جانتا ہے
وَكَفٰى : اور کافی ہے
وَلِيًّا : بطور کارساز کے
بِاللّٰهِ : اللہ
مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا : جو یہودی ہوئے ان میں وہ بھی ہیں
الْكَلِمَ : کلاموں کو
وَيَقُوْلُوْنَ : اور کہتے ہیں
وَعَصَيْنَا : اور ہم نے نافرمانی کی
غَيْرَ مُسْمَعٍ : نہ سنایا ہوا ہوتے ہوئے
لَيًّا : مروڑتے ہوئے
وَطَعْنًا : اور طعنہ دیتے ہوئے
وَلَوْ اَنَّهُمْ : اور یہ کہ اگر وہ
سَمِعْنَا : ہم نے سنا
وَاسْمَعْ : اور (کہتے) آپ سنیے
لَكَانَ : تو یقیناً وہ ہوتا
لَّهُمْ : ان کے لیے
وَلٰكِنْ : اور لیکن
اللّٰهُ : اللہ نے
فَلَا يُؤْمِنُوْنَ : پس وہ ایمان نہیں لائیں گے
قَلِيْلًا : تھوڑا

يَشْتَرُوْنَ : وہ لوگ خریدتے ہیں
وَيُرِيْدُوْنَ : اور چاہتے ہیں
تَضِلُّوا : تم لوگ (بھی) گمراہ ہو
وَاللّٰهُ : اور اللہ
بِاَعْدَآئِكُمْ : تمہارے دشمنوں کو
بِاللّٰهِ : اللہ
وَّكَفٰى : اور کافی ہے
نَصِيْرًا : بطور مددگار کے
يُحَرِّفُوْنَ : جو پھیرتے ہیں
عَنْ مَّوَاضِعِهٖ : ان کے رکھنے کی جگہوں سے
سَمِعْنَا : ہم نے سنا
وَاسْمَعْ : اور (کہتے ہیں) تو سن
وَّرَاعِنَا : اور (کہتے ہیں) راعنا
بِاَلْسِنَتِهِمْ : اپنی زبانوں کو
فِي الدِّيْنِ : دین میں
قَالُوْا : کہتے
وَاَطَعْنَا : اور ہم نے اطاعت کی
وَانْظُرْنَا : اور آپ مہلت دیں ہم کو
خَيْرًا : بہتر
وَاَقْوَمَ : اور زیادہ پائیدار
لَّعَنَهُمُ : لعنت کی ان پر
بِكُفْرِهِمْ : ان کے کفر کے سبب سے
اِلَّا : مگر

آیات ۴۷ تا ۵۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ

مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝

ط م س

طَمَسَ ۔ يَطْمِسُ (ض) طَمْسًا : کسی چیز کا حلیہ بگاڑ دینا' نام ونشان مٹا دینا۔ آیت زیر مطالعہ۔

اِطْمِسْ (فعل امر) : تو بگاڑ دے۔ ﴿رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ﴾ (یونس:۸۸) ''اے ہمارے ربّ! تو برباد کر دے ان کے اموال کو۔''

ف ت ل

فَتَلَ ۔ يَفْتِلُ (ض) فَتْلًا : رسی بٹنا۔

فَتِيْلٌ: بٹی ہوئی باریک بتی' دھاگہ' آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب : ''مُصَدِّقًا'' حال ہے۔ ''فَنَرُدَّ'' کا فاسببہ ہے اس لیے مضارع ''نَرُدَّ'' حالتِ نصبی میں ہے۔ فاسببہ پر عطف ہونے کی وجہ سے ''اَوْ نَلْعَنَهُمْ'' منصوب ہوا ہے اور اس میں ''هُمْ'' کی ضمیر ''وُجُوْهًا'' کے لیے ہے۔ ''كَانَ'' کا اسم ''اَمْرُ اللّٰهِ'' ہے اور ''مَفْعُوْلًا'' اس کی خبر ہے اور یہ آفاقی صداقت کا بیان ہے۔ ''اَنْ يُّشْرَكَ'' کا نائب فاعل محذوف ہے جو کہ ''شَيْءٌ'' ہو سکتا ہے۔ ''بِهٖ'' کی ضمیر اللہ کے لیے ہے۔ ''اِثْمًا عَظِيْمًا'' حال ہے۔ ''فَتِيْلًا'' تمیز ہے۔ ''بِهٖ'' کی ضمیر ''الْكَذِبَ'' کے لیے ہے۔ ''اِثْمًا مُّبِيْنًا'' تمیز ہے۔

ترجمہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ : اے لوگو جن کو	اُوْتُوا : دی گئی
الْكِتٰبَ : کتاب	اٰمِنُوْا : تم ایمان لاؤ
بِمَا : اس پر جو	نَزَّلْنَا : ہم نے اتارا
مُصَدِّقًا : تصدیق کرنے والا ہوتے ہوئے	لِّمَا : اس کی جو
مَعَكُمْ : تمہارے ساتھ ہے	مِّنْ قَبْلِ : اس سے پہلے
اَنْ : کہ	نَّطْمِسَ : ہم بگاڑ دیں
وُجُوْهًا : کچھ چہروں کو	فَنَرُدَّهَا : پس ہم لوٹا دیں ان کو
عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ : ان کی پیٹھوں پر	اَوْ : یا
نَلْعَنَهُمْ : پھر ہم لعنت کریں	كَمَا : جیسے کہ
لَعَنَّآ : ہم نے لعنت کی	اَصْحٰبَ السَّبْتِ : ہفتے کے دن والوں پر
وَكَانَ : اور ہوتا ہے	اَمْرُ اللّٰهِ : اللہ کا حکم
مَفْعُوْلًا : کیا ہوا	اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ

لَا يَغْفِرُ :نہیں بخشے گا	اَنْ :(اس کو) کہ
يُّشْرَكَ :شریک کیا جائے (کچھ بھی)	بِهٖ :اس کے ساتھ
وَيَغْفِرُ :اور وہ بخش دے گا	مَا :اس کو جو
دُوْنَ ذٰلِكَ :اس کے علاوہ ہے	لِمَنْ :جس کے لیے
يَّشَآءُ :وہ چاہے گا	وَمَنْ :اور جو
يُّشْرِكْ :شرک کرتا ہے	بِاللّٰهِ :اللہ کے ساتھ
فَقَدِ افْتَرٰٓى :تو اس نے جھوٹ گھڑا ہے	اِثْمًا عَظِيْمًا :ایک عظیم گناہ ہوتے ہوئے
اَلَمْ تَرَ :کیا آپؐ نے غور نہیں کیا	اِلَى الَّذِيْنَ :ان (کی حالت) کی طرف جو
يُزَكُّوْنَ :تزکیہ کرتے ہیں	اَنْفُسَهُمْ :اپنے نفس کا
بَلِ اللّٰهُ : بلکہ اللہ	يُزَكِّيْ :تزکیہ کرتا ہے
مَنْ :اس کا، جس کا	يَّشَآءُ :وہ چاہتا ہے
وَلَا يُظْلَمُوْنَ :اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا	فَتِيْلًا :کسی دھاگے برابر بھی
اُنْظُرْ :تو دیکھ	كَيْفَ :کیسے
يَفْتَرُوْنَ :وہ گھڑتے ہیں	عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر
الْكَذِبَ :جھوٹ	وَكَفٰى :اور کافی ہے
بِهٖٓ :وہ	اِثْمًا مُّبِيْنًا :بطور واضح گناہ کے

نوٹ ۱: کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ مذکورہ آیت ۴۷ کے نزول کے بعد بے شمار یہود و نصاریٰ ایمان نہیں لائے پھر بھی مذکورہ عذاب نازل نہیں ہوا۔ یہ سوال قرآن مجید کے طرزِ بیان کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی ؒ کا کہنا ہے کہ سرے سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' کیونکہ یہاں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ عذاب ضرور واقع ہوگا' بلکہ اس کے امکان کا ذکر ہے۔ (منقول از معارف القرآن)

ہمارے چند متقدمین نے اس کو استعارۃً لیا ہے۔ مثلاً مجاہدؒ کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ حق کے راستے سے دھکیل کر گمراہی کی طرف متوجہ کر دیں۔ ابوزیدؒ کے نزدیک لوٹا دینا یہ تھا کہ ارضِ حجاز سے بلادِ شام میں پہنچا دیا جائے (منقول از تفسیر ابن کثیر)۔ استعارے کی گنجائش اس لیے بھی نکلتی ہے کہ وُجُوْهٌ کا لفظ چہروں کے علاوہ پوری شخصیت اور توجہ وغیرہ کے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

نوٹ ۲: کوئی شخص اگر مرنے سے پہلے کسی بھی گناہ سے سچی توبہ کر لے تو وہ معاف ہو جائے گا' یہاں تک کہ شرک بھی سچی توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ آیت ۴۸ میں ایسے لوگوں کا ذکر ہے جن کو توبہ کی توفیق نصیب نہیں ہوئی۔ ایسے لوگوں میں سے جو شرک میں ملوث تھے' تو وہ معاف نہیں ہوگا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے۔ اگر کوئی شرک میں ملوث نہیں تھا لیکن کچھ دوسرے گناہ تھے' تو ان کی معافی کا امکان ہے۔ اور یہ فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر کرے گا کہ کس کا کون سا گناہ معاف کیے جانے کے قابل ہے۔

نوٹ ۳: آیت ۴۹ میں ﴿اَلَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ﴾ کا ہم نے لفظی ترجمہ کیا ہے۔ سات مختلف ترجموں میں چیک کیا تھا اور ان سب میں اس کا مطلب یہ دیا گیا ہے کہ جو لوگ خود کو پاکیزہ سمجھتے ہیں یا اپنی پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ یہ دراصل تفسیری ترجمہ ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔

اس آیت میں جو طرزِ بیان ہے وہ قرآن مجید میں اور بھی متعدد مقامات پر اختیار کیا گیا ہے۔ ان میں سے صرف ایک کے حوالے سے ان شاء اللہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یقیناً آپؐ ہدایت نہیں دیتے اس کو جس کو آپؐ چاہیں بلکہ اللہ ہدایت دیتا ہے اس کو جس کو وہ چاہتا ہے' اور وہ خوب جانتا ہے ہدایت پانے والوں کو''۔ (القصص:۵۶)۔ اس مقام پر یہ بات بہت واضح ہے کہ اس آیت میں ہدایت دینے کی کوشش کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ یہ نہ صرف مطلوب اور محمود ہے بلکہ بعض اوقات فرض بھی ہے۔ البتہ یہ بات سمجھانا مقصود ہے کہ ہماری اس کوشش کا نتیجہ کس کے حق میں نکلے گا' کب نکلے گا اور کتنا نکلے گا' یہ سارے فیصلے کلیتاً اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہیں اور یہ فیصلے وہ اپنے علمِ کامل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس لیے اپنی کوشش میں لگے رہو اور نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔ اسی کا نام توکّل ہے۔

اسی طرح آیت زیرِ مطالعہ میں بھی اپنے نفس کا تزکیہ کرنے کی کوشش کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ یہ کوشش بھی مطلوب و محمود ہے۔ البتہ یہاں ایسے لوگوں کی مذمّت کی گئی ہے جو اس کوشش کے نتیجے کو یقینی سمجھ کر خود کو پاک سمجھنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں۔ آیت کے مفہوم کے اسی پہلو کو تفسیری ترجموں میں اُجاگر کیا گیا ہے۔

نوٹ ۴: آیت ۴۸ میں اللہ تعالیٰ نے قطعی اعلان کر دیا ہے کہ وہ شرک معاف نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر صاحبِ ایمان کا یہ فرض بنتا ہے کہ شرک کو پہچاننے کی وہ خود استعداد حاصل کرے اور دوسروں کے کہنے پر بھروسہ نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میدانِ حشر میں یہ بات قبول نہیں کی جائے گی کہ فلاں نے ہم کو غلط بتایا تھا' اس لیے اس کو پکڑو اور ہم کو چھوڑ دو۔ وہ بھی پکڑا جائے گا اور ساتھ میں ہم بھی پکڑے جائیں گے۔ قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر اس بات کی وضاحت موجود ہے' مثلاً الاعراف:۳۸' الاحزاب:۶۷ وغیرہ۔ غلط لوگوں کی پیروی کرنے والوں کا جرم یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ غور و فکر اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال نہیں کیا اور کسی تحقیق کے بغیر دوسروں کی پیروی کی (بنی اسرائیل:۳۶)۔ اس لیے کم از کم شرک کی حد تک تو یہ لازمی ہے کہ دوسروں سے فتویٰ مانگنے کے بجائے ہم خود فیصلہ کر سکیں کہ کیا شرک ہے اور کیا نہیں ہے؟ اسی مقصد سے اس نوٹ میں شرک کے متعلق ضروری معلومات فراہم کی جا رہی ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ ایک المیہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں شرک ان قوموں نے کیا جو اللہ اور آخرت کو مانتے تھے۔ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنایا جبکہ بنو اسماعیل نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا۔ اس پس منظر میں یہ ایک معجزہ ہے کہ اُمتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تا حال شرک بالذات سے بچی ہوئی ہے' لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں دوسروں کو شریک کرنے کے جرم سے ہم لوگ بھی نہ بچ سکے۔ اس لیے اس نوٹ میں ہم شرک فی الصفات کے متعلق کچھ اصولی باتیں سمجھیں گے تاکہ اس کو پہچاننے کی

صلاحیت حاصل ہو جائے۔

شرک فی الصفات میں مغالطہ لاحق ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہماری زبان میں جو الفاظ اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے استعمال ہوتے ہیں وہی الفاظ مخلوق کی صفات کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اللہ سمیع ہے تو ہم بھی سنتے ہیں' اللہ عالم ہے تو ہم بھی عالم ہیں وغیرہ۔ اس سبب سے پیدا ہونے والے مغالطے سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ اور مخلوق کی صفات میں تین بنیادی فرق ذہن میں رکھیں تا کہ شرک فی الصفات سے بچ سکیں۔

(۱) پہلا فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذاتی ہیں' کسی نے اس کو دی نہیں' جبکہ مخلوق کی صفات ان کی ذاتی نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کی ہیں تو ان کو ملی ہیں۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اسے ہمیشہ سے حاصل ہیں اور ہمیشہ رہیں گی' جبکہ مخلوق کی صفات حادث بھی ہیں اور فانی بھی۔ حادث کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق میں صفات پہلے نہیں تھیں' اللہ تعالیٰ کے عطا کرنے سے اسے حاصل ہوئیں۔ فانی کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کی صفات ختم ہو جاتی ہیں۔

(۳) تیسرا اور بہت اہم فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات لامحدود ہیں جبکہ مخلوق کی صفات محدود ہیں۔ مثلاً جو آواز فاصلے پر ہو' اسے ہم نہیں سن سکتے۔ آواز اگر ہلکی ہو تو آواز کا احساس ہوتا ہے لیکن بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر ہمارے سامنے کئی افراد بیک وقت ایک دوسرے سے بات (cross talk) شروع کر دیں تو سب کی آواز ہمارے کان میں آئے گی لیکن بات کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یہ سب کچھ ہماری صفتِ سماعت کے محدود ہونے کا ثبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ سماعت کے لامحدود ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فاصلے اس کے لیے بے معنی ہیں۔ بندہ چاہے قطب شمالی پر ہو یا قطب جنوبی پر' وہ سب کی سنتا ہے۔ آواز کا تیز یا ہلکا ہونا بھی اس کے لیے بے معنی ہے' وہ تو دل میں آنے والے خیال بھی سن لیتا ہے۔ اگر پوری دنیا کے انسان اسے بیک وقت پکاریں تو وہ ہر ایک کی سن لیتا ہے۔ اسی طرح ہم بقیہ صفات کے محدود اور لامحدود ہونے کا فرق سمجھ سکتے ہیں۔

یہ ایک پیمانہ (yard stick) ہے جس پر رکھ کر ہر شخص خود معلوم کر سکتا ہے کہ کیا شرک ہے اور کیا شرک نہیں ہے۔ اب یہ بھی نوٹ کر لیں کہ قرآن مجید میں شرک سے متعلق آیات کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے اور ان میں اکثر شرک فی الصفات سے متعلق ہیں۔ نمونے کے طور پر صرف دو آیات دیکھ لیں:

(۱) ''اور تم لوگ اُس کے علاوہ جن لوگوں کو پکارتے ہو وہ قطمیر (کھجور کی گٹھلی پر پائی جانے والی سفید جھلّی) کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم لوگ ان کو پکارو گے تو وہ لوگ تمہاری پکار کو نہیں سنیں گے' اور اگر سنیں گے تو تم لوگوں کی حاجت روائی نہیں کر سکیں گے' اور قیامت کے دن انکار کریں گے تم لوگوں کے شرک کا۔'' (فاطر: ۱۳' ۱۴)

(۲) ''اسی کو (یعنی اللہ کو ہی) پکارنا حق ہے۔ اور یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں وہ ان کے کچھ کام نہیں آتے مگر (اس طرح) جیسے کسی نے پانی کی طرف دونوں ہتھیلیاں پھیلائیں کہ وہ اس کے منہ تک آ پہنچے اور وہ اس تک پہنچنے والا نہیں ہے۔'' (الرعد: ۱۴)

آیات ۵۱ تا ۵۵

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝

ج ب ت

(x) :اس مادہ سے کوئی فعل استعمال نہیں ہوا۔

جِبْتٌ: انتہائی نکمی اور ناکارہ چیز۔ واحد اور جمع سب کے لیے ہے۔ پھر استعارۃً بتوں، جادوگروں اور نجومیوں کے لیے آتا ہے (مفردات القرآن) آیت زیر مطالعہ۔

ن ق ر

نَقَرَ۔ یَنْقُرُ (ن) نَقْرًا: (۱) ٹھونگے مار کر کسی چیز میں سوراخ یا گڑھا کرنا۔ (۲) پھونک مار کر بانسری یا بگل بجانا۔ ﴿فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝﴾ (المدثر) ''پھر جب پھونکا جائے گا بگل میں (یعنی صور پھونکا جائے گا)۔''

نَاقُوْرٌ: بگل، صور۔

نَقِيْرٌ: کھجور کی گٹھلی کا گڑھا۔ یہ کسی انتہائی حقیر چیز کے لیے عربی محاورہ ہے جس کا اردو متبادل ہے ''تل بھر''۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب: ''اُوْتُوْا'' کا نائب فاعل اس میں ''ھُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''اِلَى الَّذِيْنَ'' کے لیے ہے اور ''نَصِيْبًا'' مفعول ثانی ہے۔ ''الطَّاغُوْتِ'' حرفِ جر ''ب'' پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہوا ہے۔ ''هٰٓؤُلَآءِ'' اشارہ ہے ''لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا'' کے لیے جبکہ ''سَبِيْلًا'' تمیز ہے۔ ''اَمْ لَهُمْ'' میں ''اَمْ'' استفہام کا ہے یعنی ''اَ'' کے معنی میں ہے۔

ترجمہ:

اَلَمْ تَرَ: کیا آپؐ نے غور نہیں کیا	اِلَى الَّذِيْنَ: ان کی طرف جن کو
اُوْتُوْا: دیا گیا	نَصِيْبًا: ایک حصہ
مِّنَ الْكِتٰبِ: کتاب سے	يُؤْمِنُوْنَ: وہ ایمان لاتے ہیں
بِالْجِبْتِ: توہمات پر	وَالطَّاغُوْتِ: اور طاغوت پر
وَيَقُوْلُوْنَ: اور کہتے ہیں	لِلَّذِيْنَ: ان کے لیے جنہوں نے
كَفَرُوْا: کفر کیا	هٰٓؤُلَآءِ: کہ یہ لوگ

اَهْدٰی : زیادہ ہدایت پر ہیں	مِنَ الَّذِیْنَ : ان سے جو
اٰمَنُوْا : ایمان لائے	سَبِیْلًا : بلحاظ راستے کے
اُولٰٓئِکَ : وہ لوگ	الَّذِیْنَ : وہ ہیں
لَعَنَهُمُ : لعنت کی جن پر	اللّٰهُ : اللہ نے
وَمَنْ : اور جس پر	یَّلْعَنِ : لعنت کرتا ہے
اللّٰهُ : اللہ	فَلَنْ تَجِدَ : تو تُو ہرگز نہیں پائے گا
لَهٗ : اس کے لیے	نَصِیْرًا : کوئی مددگار
اَمْ : کیا	لَهُمْ : ان کے لیے
نَصِیْبٌ : کوئی حصہ ہے	مِّنَ الْمُلْكِ : سلطنت میں
فَاِذًا : پھر تو	لَّا یُؤْتُوْنَ : وہ نہیں دیں گے
النَّاسَ : لوگوں کو	نَقِیْرًا : تل بھر بھی
اَمْ : یا	یَحْسُدُوْنَ : وہ حسد کرتے ہیں
النَّاسَ : لوگوں سے	عَلٰی مَآ : اس پر جو
اٰتٰىهُمُ : دیا ان کو	اللّٰهُ : اللہ نے
مِنْ فَضْلِهٖ : اپنے فضل سے	فَقَدْ اٰتَیْنَآ : تو ہم دے چکے ہیں
اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ : ابراہیمؑ کے پیروکاروں کو	الْكِتٰبَ : کتاب
وَالْحِكْمَةَ : اور حکمت	وَاٰتَیْنٰهُمْ : اور ہم نے دی ان کو
مُّلْكًا عَظِیْمًا : ایک شاندار سلطنت	فَمِنْهُمْ مَّنْ : تو ان میں وہ بھی ہیں جو
اٰمَنَ : ایمان لائے	بِهٖ : اس پر
وَمِنْهُمْ مَّنْ : اور ان میں وہ بھی ہیں جو	صَدَّ : رکے رہے
عَنْهُ : اس سے	وَكَفٰی : اور کافی ہے
بِجَهَنَّمَ : جہنم	سَعِیْرًا : بطور شعلوں والی آگ کے

آیات ۵۶ تا ۵۸

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِیْهِمْ نَارًا ؕ كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَیْرَهَا لِیَذُوْقُوا الْعَذَابَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ۝ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا ؕ لَهُمْ فِیْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِیْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا بَصِیْرًا ۝

ن ض ج

نَضِجَ ۔ یَنْضَجُ (س) نَضْجًا : پھل یا گوشت کا پکنا۔ آیت زیر مطالعہ۔

ج ل د

جَلَدَ یَجْلِدُ (ض) جَلْدًا : چمڑے یا کھال پر مارنا۔

اِجْلِدْ (فعل امر): تُو مار۔ ﴿فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً﴾ (النور:٤) ''تو تم لوگ مارو ان کو اسّی کوڑے۔''

جَلْدَةٌ : کوڑا۔

جِلْدٌ ج جُلُوْدٌ : کھال۔ آیت زیر مطالعہ۔

ترکیب : ''نُصْلِیْ'' کا مفعول اوّل ''ھِمْ'' کی ضمیر ہے اور ''نَارًا'' مفعول ثانی ہے۔ ''کُلَّمَا'' شرطیہ ہے اس لیے ''نَضِجَتْ'' ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ ''بَدَّلْنَا'' کا مفعول اوّل ''ھُمْ'' ہے اور ''جُلُوْدًا'' مفعول ثانی ہے۔ ''غَیْرَھَا'' میں ''ھَا'' کی ضمیر ''جُلُوْدٌ'' کے لیے ہے۔ ''اَنْ تَحْکُمُوْا'' کا ''اَنْ''، ''یَاْمُرُکُمْ'' پر عطف ہے۔

ترجمہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ : بے شک وہ لوگ جنہوں نے	کَفَرُوْا : انکار کیا
بِاٰیٰتِنَا : ہماری نشانیوں کا	سَوْفَ : عنقریب
نُصْلِیْھِمْ : ہم ڈالیں گے ان کو	نَارًا : ایک آگ میں
کُلَّمَا : جب کبھی بھی	نَضِجَتْ : پک جائیں گی
جُلُوْدُھُمْ : ان کی کھالیں	بَدَّلْنٰھُمْ : تو ہم تبدیل کر دیں گے ان کو (یعنی ان کے لیے)
جُلُوْدًا : کھالوں کو	غَیْرَھَا : ان کے (یعنی پہلی کھالوں کے) علاوہ
لِیَذُوْقُوا : تاکہ وہ لوگ چکھیں	الْعَذَابَ : عذاب کو
اِنَّ اللّٰهَ : یقیناً اللہ	کَانَ : ہے
عَزِیْزًا : بالادست	حَکِیْمًا : حکمت والا
وَالَّذِیْنَ : اور وہ (لوگ) جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے
وَعَمِلُوا : اور عمل کیے	الصّٰلِحٰتِ : نیک
سَنُدْخِلُھُمْ : ہم داخل کریں گے ان کو	جَنّٰتٍ : ایسے باغات میں
تَجْرِیْ : بہتی ہیں	مِنْ تَحْتِھَا : جن کے نیچے سے
الْاَنْھٰرُ : نہریں	خٰلِدِیْنَ : ایک حالت میں رہنے والے ہیں
فِیْھَا : ان میں	اَبَدًا : ہمیشہ
لَھُمْ : ان کے لیے ہیں	فِیْھَا : ان میں
اَزْوَاجٌ مُّطَھَّرَةٌ : پاک کیے ہوئے جوڑے	وَّنُدْخِلُھُمْ : اور ہم داخل کریں گے ان کو

ظِلًّا ظَلِيْلًا :ہمیشگی والے سائے میں
يَاْمُرُكُمْ :حکم دیتا ہے تم لوگوں کو
تُؤَدُّوا :تم لوٹا دو
اِلٰٓى اَهْلِهَا :ان کے اہل (یعنی اہلیت والوں) کی طرف
حَكَمْتُمْ :تم فیصلہ کرو
اَنْ :(تو یہ) کہ
بِالْعَدْلِ :عدل سے
نِعِمَّا :کیا ہی اچھی ہے جو
بِهٖ :اس کے بارے میں
كَانَ :ہے
بَصِيْرًا :دیکھنے والا

اِنَّ اللّٰهَ :بے شک اللہ
اَنْ :کہ
الْاَمٰنٰتِ :امانتوں کو
وَاِذَا :اور جب بھی
بَيْنَ النَّاسِ :لوگوں کے مابین
تَحْكُمُوْا :تم لوگ فیصلہ کرو
اِنَّ اللّٰهَ :بے شک اللہ
يَعِظُكُمْ :وہ نصیحت کرتا ہے تم کو
اِنَّ اللّٰهَ :یقیناً اللہ
سَمِيْعًا :سننے والا

نوٹ ۱ :جن لوگوں کے بدن پر کبھی کوئی پھوڑا یا پھنسی نکلی ہے وہ جانتے ہیں کہ جب وہ پک جاتے ہیں تو ان کی کھال گل کر الگ ہو جاتی ہے اور نیچے سے نئی کھال نکلتی ہے۔ اس وقت وہ اتنی نازک اور حساس ہوتی ہے کہ اگر کوئی چیز اس کو چھو جائے تو آدمی بلبلا اٹھتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کا تجربہ ہے وہ کسی درجے میں ﴿لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ﴾ کا مفہوم سمجھ سکتے ہیں۔

نوٹ ۲ : آیت ۵۸ میں لفظ امانات جمع کے صیغے میں آیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ صرف مال و دولت ہی امانت نہیں ہوتی بلکہ اس کی اور بھی قسمیں ہیں۔ مثلاً ایک حدیث کے مطابق کسی مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اس مجلس کی امانت ہے اور اہلِ مجلس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو بتانا خیانت ہے۔ ایک دوسری حدیث کے مطابق جس شخص سے کوئی مشورہ طلب کیا جائے تو وہ امین ہوتا ہے' اس لیے اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو مشورہ مانگنے والے کے حق میں مفید ہے۔ اگر جانتے بوجھتے غلط مشورہ دیا تو اس نے خیانت کی۔

اسی طرح خانہ کعبہ کی کنجی کی تولیت کے مسئلہ پر اس آیت کا نازل ہونا واضح کر دیتا ہے کہ جو بھی عہدے اور منصب ہیں' وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں اور ان کے امین وہ حکام ہیں جن کو ان عہدوں پر تقرری کا اختیار حاصل ہے۔ ان کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو علم و عمل اور کسی قابلیت کے لحاظ سے اس عہدے کا اہل نہیں ہے۔ حکومت کے عہدے باشندگانِ ملک کے حقوق نہیں ہیں جنہیں آبادی کے تناسب کے اصول پر تقسیم کیا جائے' بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ امانتیں ہیں جو صرف ان کے اہل لوگوں کو دیے جا سکتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی بنیاد پر' اہلیت معلوم کیے بغیر دے دیا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے' نہ اس کا فرض قبول ہوگا نہ نفل' یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔ (منقول از معارف القرآن)

ذِکر اللہ کی فضیلت

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ ؓ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ ﷺ : ((اَلَا اُنَبِّئُکُمْ بِخَیْرِ اَعْمَالِکُمْ وَاَزْکَاھَا عِنْدَ مَلِیْکِکُمْ وَاَرْفَعِھَا فِیْ دَرَجَاتِکُمْ وَخَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ اِنْفَاقِ الذَّھَبِ وَالْوَرَقِ وَخَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ اَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّکُمْ فَتَضْرِبُوْا اَعْنَاقَھُمْ وَیَضْرِبُوْا اَعْنَاقَکُمْ؟)) قَالُوْا: بَلٰی! قَالَ: ((ذِکْرُ اللّٰہِ تَعَالٰی)) (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

حضرت ابوالدرداء ؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ عمل بتاؤں جو تمہارے سارے اعمال میں بہتر' اور تمہارے مالک کی نگاہ میں پاکیزہ تر ہے' اور تمہارے درجات کو دوسرے تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے' اور راہِ خدا میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی زیادہ اس میں خیر ہے' اور اس جہاد سے بھی زیادہ تمہارے لیے اس میں خیر ہے جس میں تم اپنے دشمنوں (اور اللہ کے دشمنوں) کو موت کے گھاٹ اتارو اور وہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیں؟ صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں' (یارسول اللہ! ایسا قیمتی عمل ضرور بتایئے)۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''وہ اللہ کا ذکر ہے۔''

اس حدیث کے راوی حضرت ابوالدرداء ؓ ہیں جن کا شمار رسول اللہ ﷺ کے ممتاز صحابہ کرام ؓ میں ہوتا ہے۔ ان کو قرآن مجید کے ساتھ خصوصی لگاؤ تھا۔ وہ حافظ قرآن تھے اور اس بارے میں انہیں سند کا درجہ حاصل تھا۔ زہد وتقویٰ اور علم وعمل میں وہ اونچے مقام پر فائز تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جذبۂ شہادت سے بھی سرشار تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جنگ اُحد میں ان کی جانبازی دیکھی تو انہیں **نعم الراکب** (اچھا سوار) فرمایا۔ مواخات کے موقعہ پر انہیں حضرت سلمان فارسی ؓ کا بھائی قرار دیا گیا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو اپنی طرف متوجہ کر کے فرمایا: ''کیا میں تم کو وہ عمل بتاؤں جو تمہارے درجات کو دوسرے تمام اعمال سے زیادہ بلند کرنے والا ہے' یہاں تک کہ سونا چاندی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اور اس جہاد وقتال سے بھی بہتر ہے جس میں تم اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو قتل کرو' وہ تمہاری گردنیں ماریں اور تم ان کو قتل کرو؟'' صحابہؓ نے عرض کیا: کیوں نہیں' یارسول اللہ ﷺ! آپ ایسا عمل ضرور بتایئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اس درجہ کا قیمتی عمل اللہ کا ذکر ہے''۔ اللہ کے ذکر کی یہ فضیلت قرآن کے الفاظ ﴿وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ﴾ (العنکبوت:۴۵) کی تفسیر وتشریح ہے۔ یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد وقتال بھی اونچے درجے کے عمل ہیں' البتہ یہ عمل اور اس طرح کے دوسرے نیک اعمال اپنے اپنے

مواقع پر کیے جاتے ہیں' مگر اللہ کا ذکر وہ عمل ہے جو شب و روز کے تمام اوقات میں کیا جاتا ہے۔ پھر ہر عمل کی فضیلت دوسرے اعمال پر کسی ایک اعتبار سے ہوتی ہے اور کسی دوسرے اعتبار سے کوئی اور عمل اس سے اعلیٰ قرار پاتا ہے۔ مثال کے طور پر رمضان کا روزہ بڑی فضیلت کا باعث ہے' مگر پر مشقت سفر میں روزہ نہ رکھنا یعنی افطار کرنا' روزہ رکھنے سے بہتر ہوتا ہے۔

ذکر کا معنی یاد کرنا ہے اور ذکر اللہ کا مطلب ہے اللہ کو یاد کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس' توحید و تمجید اور عظمت و کبریائی کو ظاہر کرنے والے الفاظ ذکر اللہ شمار ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا ذکر تلاوتِ قرآن ہے' کیونکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے ''الذِّکر'' قرار دیا ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝۹﴾ (الحجر) ''ہم نے ہی یہ ذکر نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔ پھر نماز کو بھی ذکر کہا گیا ہے: ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۝۱۴﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میرے ذکر کے لیے۔''

اللہ تعالیٰ کا ذکر جو پوری توجہ اور دھیان سے کیا جائے وہ انسان کی شخصیت میں معرفتِ خداوندی کا باعث بنتا ہے جو انسانیت کی معراج ہے۔ جس شخص کو اپنے خالق و مالک کی پہچان ہوگئی اس کو گوہر مقصود حاصل ہوگیا۔ اب اس کی تمام عبادت ذکر سے لبریز ہوگی اور اللہ تعالیٰ کی عظمت ہر وقت اس کے شعور میں ہوگی۔ اس لیے قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝۱۰﴾ (الجمعة) ''اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرو تاکہ تم فلاح پاؤ''۔ مسند احمد کی ایک روایت میں آتا ہے کہ اللہ کا ذکر اتنا زیادہ کرو کہ لوگ تمہیں مجنوں کہنے لگیں — قرآن مجید میں اللہ فرماتا ہے: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرة:۱۵۲) ''تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا''۔ یعنی تم مجھے یاد کرو گے تو میں تم پر نظر رحمت کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب بھی اور جہاں بھی بیٹھ کر کچھ بندگانِ خدا اللہ کا ذکر کرتے ہیں تو لازمی طور پر فرشتے ہر طرف سے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں' اور ان کو گھیر لیتے ہیں' اور رحمتِ الٰہی ان پر چھا جاتی ہے اور ان کو اپنے سایہ میں لے لیتی ہے' اور ان پر سکینہ کی کیفیت نازل ہوتی ہے' اور اللہ اپنے مقربین میں ان کا ذکر کرتا ہے'' (صحیح مسلم)۔ گویا ایک جگہ پر جمع ہو کر اللہ کا ذکر کرنا چار خاص نعمتوں کے عطا کا باعث بنتا ہے: (۱) اللہ کے فرشتے ان لوگوں کو گھیر لیتے ہیں۔ (۲) اللہ کی رحمت ان کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ (۳) ان کے دلوں پر سکینت نازل ہوتی ہے جو بہت بڑی روحانی نعمت ہے۔ (۴) اللہ تعالیٰ ان ذاکر بندوں کا ذکر اپنے مقرّب فرشتوں میں کرتے ہیں' گویا فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ میرے وہ بندے ہیں جو مجھ پر غائبانہ ایمان لاتے ہیں مگر اس کے باوجود یہ کس خلوص اور محبت کے ساتھ میرا ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا اس طرح اپنے بندوں کا ذکر مقرب فرشتوں کے سامنے کرنا بڑی خوش بختی کی بات ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ۝۲۸﴾ (الرعد) ''جان لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون اور اطمینان ملتا ہے''۔ گویا باطنی اور روحانی صفائی کے لیے ذکر اللہ سے بہتر اور کوئی عمل نہیں۔ اسی بات پر اس حدیث میں زور دیا گیا ہے۔ ذکر اللہ سے غفلت برتنے اور گناہوں کے اثر سے دل زنگ آلود ہو جاتے ہیں۔ ایک حدیث کا مفہوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے

جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگ جاتا ہے''۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ ان کو صیقل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''موت کو کثرت سے یاد کرنا اور تلاوتِ قرآن''۔ (بیہقی) اور اگر دل صاف ستھرا ہو جائے تو انسان کا سارا وجود سدھر جائے گا۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ ''انسانی جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے 'اگر وہ صحیح ہے تو سارا جسم صحیح ہے اور اگر وہ خراب ہے تو سارا جسم خراب ہے' اور وہ دل ہے''۔ (متفق علیہ) یوں جسمِ انسانی کی حقیقی صحت یعنی روحانی صحت کا دارومدار دل کی صحت پر ہے اور دل کی صحت ذکر اللہ کے ساتھ ہے۔ پس ذکر اللہ کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔ دیکھئے قرآن مجید میں بار بار ذکر اللہ کی تاکید آئی ہے:

☆ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ﴾ (الاحزاب)

''اے اہلِ ایمان اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو''

☆ ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴾ (آل عمران)

''اپنے رب کا ذکر کثرت سے کرو اور صبح و شام اسی کی تسبیح بیان کرو''

☆ ﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ (قٓ)

''اور اپنے ربّ کی تسبیح حمد کے ساتھ بیان کرتے رہو سورج نکلنے سے پہلے' اور سورج غروب ہونے سے پہلے۔ اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح کرتے رہو اور نماز کے بعد بھی''

موقع کی مناسبت سے ذکر آہستہ آواز سے بھی کر سکتے ہیں اور اونچی آواز سے بھی۔ جب کچھ سننے والے موجود ہوں تو ذکر بلند آواز سے بھی ہو سکتا ہے' ورنہ آہستہ آواز میں ذکر اچھا ہے۔ ذاکر کو ذکر کرتے وقت اللہ کے سامنے عاجزی اور خشیت کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ اس کی رضا حاصل ہو اور ذکر قبولیت کا درجہ پالے۔ ذکر اللہ میں نمود و نمائش اور ریاکاری ثواب کے بجائے گناہ کا باعث بن جاتی ہے۔

ذکر زبان سے ہو مگر ذاکر کا عمل اس کے ذکر کی تائید کر رہا ہو۔ جب وہ سبحان اللہ کہے تو اس احساس و شعور کے ساتھ کہ اللہ ربّ العزت ہر قسم کی کمزوری سے پاک اور منزّہ ہے۔ جب وہ الحمد للہ کہے تو سمجھ رہا ہو کہ ساری تعریفیں اللہ کے لیے ہیں۔ اگر مخلوق کا کوئی فرد قابلِ تعریف ہے تو اس میں یہ خوبی اس کی اپنی پیدا کی ہوئی نہیں ہے بلکہ عطیہ خداوندی ہے۔ جب لا الٰہ الا اللہ کہے تو جان لے کہ معبودِ حقیقی صرف اللہ ہی ہے اور وہی ہر شے کا خالق و مالک ہے' اس کے سوا سب کچھ اس کی مخلوق اور اس کے سامنے حاجت مند ہے۔ تمام مخلوقات کی ضرورتوں کو بس وہی پورا کرنے والا ہے' علیٰ ہذا القیاس۔

عام طور پر مسنون دعاؤں کی کتابوں سے ذکر کے الفاظ یاد کر کے ان کو وظیفہ بنا لیا جاتا ہے مگر کردار و عمل کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ یہ انداز خود فریبی ہے۔ ذکر اللہ کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ اس سے اچھا کردار وجود میں آئے۔ ذاکر ایسی شخصیت کا حامل ہو کہ معاشرے کے افراد اس کے اخلاق اور معمولات سے متاثر ہوں۔ وہ وعدہ کرے تو سمجھ لیا جائے کہ پورا کرے گا۔ اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے تو اس کی دیانت داری پر بھروسہ ہو۔ پنجگانہ نماز کا اہتمام کرے۔ رمضان آئے تو دن کے روزے اور رات کے قیام کو خوش دلی اور آمادگی سے اختیار

کرے۔ غرض دین کے تمام تقاضوں کو پورا کرنے والا ہو۔ ہاں اتنی احتیاط کے ساتھ زندگی گزارنے کی کوشش کے باوجود انسان سے خطائیں' کوتاہیاں اور گناہ بھی ضرور صادر ہوں گے' کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ چنانچہ اپنی خطاؤں پر توبہ استغفار کرے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کی امید رکھے۔

جب ذکر اللہ کی اتنی فضیلت ہے کہ اسے انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد وقتال پر بھی فضیلت حاصل ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے لیے کوئی ضابطہ اور شرائط ہوں گی۔ چنانچہ دھیان رکھنا ہوگا کہ ذاکر کی زبان سے نکلنے والے الفاظ اس کے کردار وعمل کے عکاس ہوں' عقیدۂ توحید اس کے رگ وریشے میں پیوست ہو' حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا اہتمام ہو' سب سے بڑھ کر یہ کہ خوراک اور لباس رزقِ حلال سے آ رہے ہوں۔ ان آداب کا لحاظ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر مؤمن سے یہ تقاضا ہے کہ وہ پورے کا پورا اسلام میں داخل ہو' یعنی تمام فرائض وواجبات کی پابندی کرے۔ اسلام میں اس بات کی گنجائش نہیں کہ بعض چیزوں پر تو عمل کیا جائے اور بعض کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسا کرنا یہود کا وطیرہ تھا' جو اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بنے۔

ایک بات یہ بھی پیش نظر رہے کہ مسنون اذکار کو وظیفہ ضرور بنایا جائے مگر وقت کی ضرورت کا بھی احساس کیا جائے۔ موجودہ حالات میں جب کہ ہمارے اوپر طاغوت کا نظام نافذ ہے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ غلبۂ اسلام کے لیے جدّوجہد کرے اور اس اجتماعیت کا حصہ بن جائے جس کا مقصد ملک میں نفاذِ اسلام ہو۔ اس جدّوجُہد میں تَن مَن دھن لگا دینا حالات کا تقاضا ہے۔ جب اسلام کا نفاذ ہو جائے گا تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے اور ہر مؤمن کو ذکر واذکار کے لیے سازگار ماحول میسّر آ جائے گا۔

❁❁❁

بقیہ: اجتہاد کا اجتماعی منہج

حواشی

(۱) کشف الاسرار' ج۳' ص ۱۱۳٤ ۔ والتلویح للتفتازانی' ج۲' ص ٦٧١۔

(۲) المستصفی للغزالی' ج۱۔

(۳) ترمذی' نسائی' دارمی' احمد' ابوداؤد۔

(٤) اعلام الموقعین۔

(٥) صحیح البخاری۔

(٦) صحیح البخاری: ۷۳٥۲۔

(۷) سنن کبریٰ للبیہقی۔

(۸) طبرانی فی الاوسط۔

(۹) الفقیہ والمتفقہ للخطیب' ۲:۷۳ و ۳:۲۷۷۔

(۱۰) سنن دارمی۔

(۱۱) سنن کبریٰ للبیہقی' ۱۰:۱۱٤۔

(۱۲) شرح معانی الآثار للطحاوی۔

(۱۳) سنن کبریٰ للبیہقی۔

(۱٤) المدخل الکبیر للبیہقی' ص ٤۳٤۔

(۱٥) مناقب ابی حنیفۃ للموفق المکی۔

(۱٦) مجمع الزوائد: ٤۲۸۔

(۱۷) جامع الترمذی' کتاب العلم۔

(۱۸) الطبقات الکبریٰ لابن سعد۔

❁❁❁

اجتہاد کا اجتماعی منہج

عربی مقالہ: مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ

اردو تلخیص: ابوسفیان سعید

کسی چیز کو حاصل کرنے کے لیے جو کوششیں کی جاتی ہیں لغت میں انہیں اجتہاد کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی شرعی حکم کو جاننے کے لیے جو کاوشیں کی جاتی ہیں' اصولِ فقہ کی اصطلاح میں انہیں بھی اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علمائے اصولِ فقہ نے اس کی تعریف یوں کی ہے کہ:

''فقیہہ کسی مسئلہ کے شرعی حکم کے گمان تک پہنچنے کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کردے۔''(۱)

امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ:

''شرعی احکام کی معرفت حاصل کرنے میں مجتہدین جو محنت اور جانفشانی کرتے ہیں اسے اجتہاد کہتے ہیں۔''(۲)

پہلی تعریف میں علم کے بجائے لفظ ظن (گمان) استعمال کیا گیا ہے' اس لیے کہ اجتہاد سے علمِ قطعی حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس سے علمِ ظنی کا فائدہ ہوتا ہے اور اس پر عمل کرنا لازم اور ضروری ہے۔

درحقیقت اجتہاد' شرعی احکام کی معرفت حاصل کرنے کا نام ہے۔ محدثین کرامؒ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے اصحاب سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو ملک یمن روانہ کرنے کا ارادہ فرمایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ ''اگر تمہارے پاس کوئی مسئلہ آجائے تو کس طرح فیصلہ کروگے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''میں کتاب اللہ کے ذریعے فیصلہ کروں گا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''اگر اس کے متعلق کوئی حکم کتاب اللہ میں موجود نہ ہو تو کیا کروگے؟'' تو انہوں نے جواب دیا کہ ''سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کروں گا''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''اگر تمہیں یہاں بھی کوئی صریح حکم نہ ملے تو کیا کروگے؟'' تو حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''میں اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا''۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا اور فرمایا: ''ساری تعریفیں اُس ربّ کائنات کے لیے ہیں جس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قاصد کو اس چیز کی توفیق عنایت فرمائی جسے اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پسند کرتا ہے۔''(۳)

اگرچہ بعض محدثین نے حضرت الحارث بن عمرو اور دیگر راویوں یعنی اصحابِ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے مجہول ہونے کے باعث اس حدیث کی سند کو معلول کہا ہے لیکن اس کے باوجود ہر زمانے اور ہر شہر کے علماء نے

اسے شرفِ قبولیت سے نوازا ہے۔ علامہ حافظ ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں اگرچہ اصحاب معاذ رضی اللہ عنہ کے اسماء کا تذکرہ نہیں کیا گیا' لیکن اس سے حدیث کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا' اس لیے کہ یہ شہرت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔ نیز حضرت الحارث بن عمرؓ نے اصحابِ معاذ کی جماعت سے یہ حدیث روایت کی ہے نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے۔ کسی حدیث کو جماعت سے روایت کرنا شہرت کے اعتبار سے زیادہ بلیغ ہے' اس سے کہ ان میں سے کسی ایک سے روایت کی جائے اور اس کے نام کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کے اصحاب علم و فضل' صدق و صفا' تقویٰ و پرہیزگاری اور دیانت داری و امانت داری میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے جو کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں۔ ان میں سب کے سب اُمت کے بہترین اور چنیدہ افراد تھے' اہلِ علم نے ان پر اعتماد کیا ہے' ان سے احادیث روایت کی ہیں۔ اس حدیث کے پرچم کو بلند کرنے والے شعبہ نے بھی ان سے روایت کی ہے۔ بعض ائمہ حدیث کا کہنا ہے کہ اگر کسی حدیث کی سند میں شعبہ کو دیکھو تو اپنے ہاتھ کو اس سے باندھ لو۔ ابوبکر الخطیب کا کہنا ہے کہ ''حضرت عبادہ بن نسی نے یہ حدیث حضرت عبدالرحمٰن بن غنیم سے اور انہوں نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل سے روایت کی ہے اور یہ سند متصل ہے' اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ تمام محدثین نے یہ روایت نقل کی ہے اور اس سے استدلال کیا ہے۔ ہم بھی اس حدیث کی صحت پر یقین رکھتے ہیں۔'' (۴)

اس حدیث کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو شیخین یعنی حضرت امام بخاریؒ اور حضرت امام مسلمؒ نے اپنی صحاح میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''جب حاکم کسی مسئلے میں اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد درست ہو تو اسے دہرا ثواب ملے گا اور اگر اجتہاد میں غلطی سرزد ہو جائے تو بھی اسے اجتہاد کرنے کا ثواب ملے گا۔'' (۵)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کی حدیث کے معانی و مفاہیم کی تائید و حمایت متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معمول سے بھی ہوتی ہے۔

امام دارمیؒ نے اپنی سنن میں حضرت شریحؒ سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب نے ان (شریح) کے پاس ایک مکتوب ارسال فرمایا جس میں انہیں تاکید فرمائی گئی تھی کہ:

''اگر کوئی مسئلہ درپیش ہو اور اس کا حکم کتاب اللہ میں موجود ہو تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کریں اور اس سلسلے میں لوگوں کی قطعاً پرواہ نہ کریں۔ اگر کسی مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں موجود ہو اور نہ ہی سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو جس حکم پر لوگوں کا اجماع ہو اسے اختیار کرو' اور اگر کسی مسئلہ کا حکم کتاب اللہ میں ہو نہ احادیثِ مبارکہ میں اور نہ ہی سلف صالحین میں تو دونوں امور میں سے جسے چاہو اختیار کر لو۔ اگر تم نے اجتہاد کر کے عمل کرنا چاہا تو اس پر عمل کرو اور اگر اجتہاد کر کے عمل سے گریز کرنا چاہا تو تمہارا عمل سے گریز کرنا تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔''

امام دارمیؒ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا:

''جب تم سے کسی مسئلے کے بارے میں دریافت کیا جائے تو سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم تلاش کرو' اگر اس میں نہ پاؤ تو سنتِ رسولؐ میں اسے تلاش کرو' اور اگر وہاں بھی موجود نہ پاؤ تو اجماع پر عمل کرو'

اگر اجماع بھی نہ ہو تو اجتہاد کرو۔''

انہوں نے حضرت عبداللہ بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے کسی مسئلے کے متعلق دریافت کیا جاتا تو وہ سب سے پہلے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتے' وہاں اس کا حکم موجود ہوتا تو سائل کو اس سے آگاہ کرتے۔ اگر قرآن پاک میں حکم موجود نہ ہوتا تو احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجّہ ہوتے' اگر وہاں بھی اس کا حکم نہ پاتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معمولات کی طرف التفات فرماتے' اگر یہاں بھی مسئلے کا حکم پانے میں ناکامی ہوتی تو اپنی رائے کا استعمال فرماتے۔(۶)

علامہ بیہقیؒ نے حضرت مسلمہ بن مخلد رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور فرمایا: اے میرے چچا کے صاحبزادے! اگر ہمیں فیصلے پر مجبور کیا جائے تو ہم کیا کریں؟ تو حضرت زید رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کتاب اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کریں۔ اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم موجود نہ ہو تو سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اسے تلاش کریں۔ اگر وہاں بھی نہ ملے تو اہلِ رائے کو جمع کر کے اجتہاد کریں۔ اجتہاد کے بعد فیصلہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اسی طرح امام بیہقیؒ نے حضرت ادریس الاودیؒ سے روایت کی ہے' انہوں نے فرمایا حضرت سعید بن ابو بردہ رضی اللہ عنہ ہمارے پاس ایک مکتوب لے کر آئے اور کہا کہ یہ وہ مکتوب ہے جسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے پاس ارسال کیا تھا' جس میں یہ مذکور تھا کہ اگر کسی مسئلے کا حکم قرآن و سنت میں نہ پاؤ تو اپنے فہم و فراست سے اس کا حکم تلاش کرو۔ امثال و متشابہات کا خیال رکھ کر مسئلے میں غور کرو' اور جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب ہو اسے اختیار کرنے کی کوشش کرو۔(۷)

حدیث معاذ رضی اللہ عنہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عمل کیا' جس سے اس حدیث کی تائید ہوتی ہے۔ اور علامہ ابن القیم الجوزیؒ کے قول کی توثیق ہوتی ہے کہ تمام سلف صالحین نے حدیث معاذ رضی اللہ عنہ پر عمل کیا ہے۔ اس حدیث میں انفرادی اجتہاد کا تذکرہ کیا گیا ہے' لیکن یہاں بہت سی ایسی نصوص موجود ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ مجتہد کے لیے مناسب ہے کہ وہ زیرِ غور مسئلے میں اصحاب الرائے سے مشاورت کرے' اور یہی اجتماعی اجتہاد سے مقصود و مطلوب ہے۔

اس میں اصل بات وہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے روایت کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ میں نے کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اگر کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو جس کے متعلق شریعت میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو اس کے بارے میں آپ کیا حکم فرماتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''فقہاء اور متقی لوگوں سے مشورہ کرو اور کسی کی خاص رائے پر عمل مت کرو۔''(۸)

خطیب نے بھی یہ حدیث اپنی سند سے روایت کی ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ حضرت مالک بن انسؒ نے حضرت یحییٰ بن سعیدؒ سے' انہوں نے حضرت سعید بن المسیبؒ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب سے روایت کی ہے' انہوں نے فرمایا: میں نے کہا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے بعد ہمارے سامنے کوئی ایسا مسئلہ پیش ہو جس کے متعلق قرآن کریم میں حکم ہو اور نہ اس کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہو تو میں کیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میری اُمت کے متقی اور پرہیزگار لوگوں کو جمع کرو اور ان سے مشورہ کرو' اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ مت کرو۔''(۹)

دارمیؒ نے یہ حدیث حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ سے تخریج کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ سے کسی ایسے مسئلے کے بارے میں دریافت کیا گیا جس کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی حکم موجود نہ ہو تو' آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسے مسئلے میں فقہائے اُمت غور وفکر کریں۔ (سنن دارمی)

خلفائے راشدین کا معمول یہ تھا کہ اگر ان کے سامنے کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہوتا جس کے بارے میں قرآن وسنت میں کوئی حکم موجود نہ ہوتا تو وہ اہل علم اور اہل فتویٰ سے مشاورت کرتے اور مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ امام بیہقی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں حضرت جعفر بن برقانؒ سے' انہوں نے حضرت میمون بن مہران رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے' وہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو آپؓ سب سے پہلے کتاب اللہ کی طرف رجوع فرماتے' اگر وہاں کوئی حکم موجود ہوتا تو آپؓ اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے' اگر کتاب اللہ میں اس کا حکم موجود نہ ہوتا تو سنت رسول اللہ ﷺ میں اس مسئلہ کا حل تلاش کرتے' اگر وہاں موجود ہوتا تو اس پر عمل کرتے' ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے رابطہ کرتے اور فرماتے میرے سامنے فلاں مسئلہ آیا ہے' میں نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ میں اس کا حکم تلاش کیا لیکن ناکامی ہوئی' کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کیا فیصلہ فرمایا تھا؟ تو بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کھڑی ہوتی اور کہتی کہ ہاں نبی کریم ﷺ کا اس مسئلہ میں یہ حکم ہے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس حکم کو اختیار کرتے اور اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت میمون رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابی نے بھی مجھے یہ حدیث بیان کی ہے کہ اسی وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ساری تعریفیں اس اللہ کے لیے سزاوار ہیں جس نے ہمارے درمیان ایسے افراد مخصوص فرمائے جنہوں نے محبوب آقا ﷺ کی احادیث کو محفوظ کر لیا ہے۔ اگر اس مسئلہ کے بارے میں کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے پاس نبی کریم ﷺ کا کوئی حکم موجود نہ ہوتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرماتے اور ان سے مشاورت کرتے' جس حکم پر وہ لوگ متفق ہو جاتے اس کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت میمون رضی اللہ عنہ نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن الخطاب کا بھی یہی معمول تھا۔ اگر کسی مسئلے کا حکم وہ قرآن وسنت میں نہ پاتے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فیصلوں کی طرف رجوع فرماتے' اگر وہاں حکم مل جاتا تو آپؓ اس پر عمل کرتے' ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے اور متفق علیہ فیصلہ پر عمل کرتے۔(۱۱)

روایات میں آتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب نے متعدد مسائل کے احکام کے استنباط کے لیے فقہائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا اور ان کے اجماع کے بعد احکام نافذ کیے۔ مثال کے طور پر انہوں نے عراق کی اراضی کی تقسیم اور ان پر خراج وصول کرنے کے معاملات طے کرنے کے لیے شوریٰ کا انعقاد کیا' جس میں فقہائے

انصار، مہاجر صحابہ کرام ؓ کو شامل کیا گیا تھا، ہر ایک نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا، تمام حضرات اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ عراق کی اراضی پر خراج وصول کیا جائے۔ امام ابو یوسفؒ نے اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ ''کتاب الخراج'' میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح حضرت عمر ؓ بن خطاب نے شُربِ خمر کی حد متعین کرنے کے لیے بھی صحابہ کرام ؓ کو جمع فرمایا تھا۔ امام طحاویؒ نے حضرت ابراہیم النخعیؒ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے انتقال فرمانے کے بعد لوگوں میں نماز جنازہ کی تکبیرات میں کافی اختلاف پایا جاتا تھا۔ ایک شخص کہتا تھا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو سات تکبیرات کہتے سنا ہے، دوسرا کہہ رہا تھا کہ نبی کریم ﷺ پانچ تکبیرات کہتے تھے، جبکہ تیسرے شخص کا دعویٰ تھا کہ نبی کریم ﷺ نماز جنازہ میں چار تکبیرات کہتے تھے۔ صحابہ کرام ؓ میں یہ اختلاف حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے انتقال تک موجود تھا۔ جب حضرت عمر ؓ بن خطاب خلیفہ مقرر ہوئے اور لوگوں میں اختلاف دیکھا تو انہیں یہ بہت شاق گزرا، انہوں نے صحابہ کرام ؓ کو جمع فرمایا اور کہا کہ آپ لوگ اصحابِ رسول ﷺ ہیں، اگر کسی مسئلہ میں آپ کے درمیان اختلاف پایا جائے گا تو آپ کے بعد لوگ اختلاف کرتے رہیں گے۔ جس معاملے پر آپ لوگ مجتمع ہوں گے تو آپ کے بعد بھی لوگ اس پر مجتمع ہوں گے، اور ان میں اختلاف نہیں ہوگا۔ اس لیے آپ لوگ نمازِ جنازہ کی تکبیرات پر متفق ہو جائیں، تو صحابہ کرام ؓ نے کہا امیر المؤمنین آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ ہمیں مشورہ دیں۔ تو حضرت عمر ؓ بن خطاب نے فرمایا کہ میں آپ کی طرح ایک انسان ہوں، آپ لوگ مجھے مشورہ دیں۔ تو ان لوگوں نے اس مسئلے پر غور و خوض کیا۔ اس کے بعد تمام صحابہ کرام ؓ چار تکبیرات پر متفق ہو گئے اور حضرت عمر ؓ بن خطاب نے تمام لوگوں کو نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہنے کا حکم فرما دیا۔ (۱۲)

امام بیہقیؒ نے حضرت ابو وائل سے مختصراً روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے تک اس مسئلے پر صحابہ کرام ؓ میں اختلاف تھا، بعض صحابہ کرام ؓ نماز جنازہ میں سات تکبیریں، بعض چھ، بعض پانچ یا چار کے قائل تھے۔ حضرت عمر ؓ بن خطاب نے صحابہ کرام ؓ کو جمع کیا اور ان سے مشورہ طلب کیا، چنانچہ انہوں نے تمام صحابہ کرام ؓ کو چار تکبیرات پر جمع فرما دیا۔ (۱۳)

اسی طرح صحابہ کرام ؓ جدید مسائل کے شرعی احکام جاننے یا مختلف فیہ مسائل پر اختلاف کم کرنے کے لیے مشاورت کرتے تھے۔ اجتماعی اجتہاد سے یہی مقصود ہے۔

مذکورہ روایت و دلائل سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام ؓ کے دور میں کسی جدید مسئلہ کا حکم تلاش کرنے کے لیے اجتماعی اجتہاد کا طریقہ اختیار کیا جاتا تھا۔ تاہم بعض تابعینؒ ایسے بھی تھے جو بعض مسائل میں انفرادی رائے رکھتے تھے اور دوسروں کی آراء کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے۔

امام بیہقیؒ نے ابو حصین سے روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے کوئی کسی مسئلے میں فتویٰ دیتا، اگر وہی مسئلہ حضرت عمر ؓ بن خطاب کے سامنے پیش آتا تو آپ اس کا حکم تلاش کرنے کے لیے بدری صحابہ کرام ؓ کو ضرور جمع فرماتے۔ (۱۴)

اسی طرح عہدِ صحابہ کرام ؓ کے بعد ائمہ مجتہدین بھی باہم مشاورت کر کے کسی جدید مسئلے کے حکم کا تعین

کرتے تھے۔ بعض ائمہ مجتہدین نے جدید فقہی مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے اکیڈمی قائم کی تھی جس میں وہ جمع ہوتے اور فقہی مسائل پر مذاکرات کرتے۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اجتہاد کے لیے شوریٰ کا نظام قائم کیا تھا۔ الموفق المکیؒ فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنا مسلک ہی شورائی نظام پر قائم کیا تھا۔ وہ اپنے اصحاب سے مذاکرات کے بعد ہی کسی مسئلے کا حکم متعین کرتے۔ ان کے یہاں ایک ایک مسئلہ پر کئی کئی روز بلکہ مہینوں تک بحث ومباحثے کا سلسلہ جاری رہتا۔(۱۵)

سابقہ روایات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جدید مسائل کے شرعی احکام تلاش کرنے کے لیے ہمارے پاس اجتماعی اجتہاد بہترین طریقہ ہے۔ عصر حاضر میں بہت سے نئے مسائل پیدا ہو رہے ہیں جن کے متعلق قرآن وسنت میں واضح احکام موجود نہیں' اسی طرح ان کے بارے میں فقہائے متقدمین بھی خاموش ہیں۔ بعض جدید مسائل ایسے ہیں جن کا تذکرہ بعض فقہائے متقدمین کی کتابوں میں ملتا ہے لیکن اس وقت اس بات کی ضرورت ہے کہ ان مسائل کے احکام کا ازسرنو جائزہ لیا جائے' اس لیے کہ جن اسباب وعلل کی بنیاد پر احکام مستنبط کیے گئے تھے وہ اب باقی نہیں رہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب کی روایت کردہ حدیث ہر زمانے اور ہر جگہ کے علماء کو دعوت دیتی ہے کہ وہ جدید مسائل کے شرعی احکام کے لیے سر جوڑ کر بیٹھیں' مذاکرات کریں اور قرآن و سنت کی روشنی میں مسائل حل کریں' جیسا کہ حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ''فقہاء اور نیک ومتقی علمائے کرام سے مشورہ کرو اور خاص رائے اختیار مت کرو۔''(۱۶)

عصرِ حاضر میں اجتماعی اجتہاد سے یہی مقصود ہے' لیکن اجتہاد کے طریقہ کار کے بارے میں گفتگو کرنے سے قبل میں بعض لوگوں کے غلط افکار وخیالات سے متنبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

یہاں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مغربی تہذیب وثقافت سے اس قدر متاثر ہیں اور اس کے اتنے زیادہ دلدادہ ہیں کہ وہ یہاں تک کہنے لگے ہیں کہ تمام شرعی احکام ازسرِنو مستنبط کیے جانے چاہئیں۔ ان کی خواہش ہے کہ تمام شرعی احکام میں اجتہاد کا عمل الف بے سے شروع کیا جائے۔ وہ لوگ قدیمی فقہی سرمایوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس کی بھی پرواہ نہیں کرتے کہ صدیوں سے تمام فقہائے کرام مسلّمہ شرعی اصول ومبادی پر متفق ہیں۔ ان لوگوں کے دعووں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم آج ہی نازل ہوا ہے اور فقہاء احادیث مبارکہ سے آج ہی واقف ہوئے ہیں۔ ان مغرب زدہ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ چودہ سو سال کے دوران کسی کو بھی قرآن واحادیث مبارکہ میں تدبر کرنے کی توفیق نہیں ہوئی یا فقہائے کرام اور ائمہ مجتہدین نے فہمِ قرآن اور احادیث مبارکہ میں غلطیاں کی ہیں۔ ان میں اس قسم کے باطل خیالات فقہائے اُمت اور ائمہ مجتہدین کی قرآن وسنّت میں گرانقدر خدمات سے ناواقفیت' بحث وتحقیق میں ان کے اعلیٰ معیار سے لاعلمی اور ان کے علم وفضل' تقویٰ و طہارت' صدق وصفا اور دیانت داری وامانت داری سے نابلد ہونے کے باعث پیدا ہو رہے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کا مقصد پوری شریعت سے انکار کرنا' ہر چیز میں تشکیک پیدا کرنا اور جدید نسل کو گمراہ کرنا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ مطلق اجتہاد کی دعوت دینے والوں کی تعداد کم نہیں' لیکن آج تک ان میں سے ایک شخص بھی کھڑا نہیں ہوا جو ازسرِنو شرعی احکام مستنبط کرنے کی کوشش کرتا اور وہ طہارت سے فرائض تک کے احکام ایک کتاب میں جمع کر دیتا۔

ہم اجتماعی اجتہاد کی دعوت اس لیے نہیں دے رہے کہ ہم مغربی افکار و خیالات کے مطابق اسلامی احکام کو ڈھالیں۔ ایسی بات ہرگز نہیں' ہمیں اجتماعی اجتہاد کی اس وقت اس لیے ضرورت ہے کہ اس وقت انسانی زندگی میں بہت زیادہ تبدیلیاں آ گئی ہیں۔ بہت سے جدید مسائل پیدا ہو رہے ہیں اور جدید تحقیقات سامنے آ رہی ہیں۔ اس صورتحال کے پیش نظر ہمارے لیے ضروری ہے کہ فقہائے متقدمین اور ائمہ مجتہدین کے وضع کردہ قواعد و ضوابط کی روشنی میں قرآن وسنت میں غور کر کے جدید مسائل کے احکام کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ فقہی مسائل میں اجتہاد کرنے کا حق پارلیمنٹ کو سونپ دیا جائے' اس لیے کہ یہ ملک کا سب سے طاقتور ادارہ ہے جہاں قوم کے منتخب نمائندے موجود ہوتے ہیں' جو مختلف علوم وفنون میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ کسی بھی جدید فقہی مسئلے کے حل میں یہ ادارہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ فقہی اجتہاد کے مفاہیم ومعانی اور اس کے تقاضوں سے بالکل نابلد ہیں' اس لیے وہ اس قسم کی تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ شرعی امور میں اجتہاد کا دارومدار عقل پر نہیں بلکہ قرآن وسنت پر ہے۔ فقہی اجتہاد کے لیے قرآنی علوم' احادیث مبارکہ' فقہ اور اصولِ فقہ میں مہارت رکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ عظیم الشان کارنامہ وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو ان علوم میں دسترس رکھتے ہوں۔ یہ مبارک عمل وہ لوگ کس طرح انجام دے سکتے ہیں جو شرعی علوم کے اصول ومبادی سے بھی واقف نہ ہوں؟ ہر شخص اس حقیقت سے واقف ہے کہ آج ارکانِ پارلیمنٹ کا انتخاب شرعی علوم سے واقف ہونے کی بنیاد پر نہیں کیا جاتا۔ اگر انہیں فقہی مسائل میں اجتہاد کرنے کی ذمہ داری دی جائے گی تو گویا کہ انہیں ایک ایسے کام کا ذمہ دار بنانا ہوگا جس کے وہ بالکل اہل نہیں۔

اسلام کی بالغ حکمت عملی یہ ہے کہ اس نے کاہنوں' برہمنوں اور عیسائیوں میں ''کیلروس'' کی طرح فقہی اجتہاد کے لیے کوئی سرکاری ادارہ قائم نہیں کیا۔ ایسا اس لیے ہوا کہ اکثر و بیشتر ادارے مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ شر وفساد کی آماجگاہ بن جاتے ہیں' ایسے لوگوں کا ان پر تسلط وغلبہ ہو جاتا ہے جو معاشرے میں طاقت وقوت کی بنیاد پر اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان اداروں پر سیاست' علاقائیت اور رنگ ونسل کے رجحان غالب ہونے لگتے ہیں' جیسا کہ نصاریٰ کی بابو یہ تاریخ میں پیش آیا۔ اسلام نے فقہی اجتہاد کے لیے سرکاری ادارہ کے قیام کے بجائے اس کے لیے صرف شرائط وضع کیے' جن کے اندر یہ شرائط پائی جائیں گی وہی فقہی اجتہاد کے اہل ہوں گے۔

اجتماعی اجتہاد کا بہتر اور افضل طریقہ وہی ہے جس کی طرف آج سے چودہ سو سال قبل محبوب آقا ﷺ نے ہماری رہنمائی فرمائی ہے' جسے حضرت علی رضی اللہ عنہ بن ابی طالب نے روایت کیا ہے' آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ:

''فقہاء اور عابدین سے مشاورت کرو اور کسی کی خاص رائے پر عمل مت کرو اور خلفائے راشدین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال واعمال پر نظر رکھو۔''

نبی کریم ﷺ نے اجتہاد کے لیے دو شرطیں وضع فرمائی ہیں:

(۱) فقہاء تفقہ فی الدین کے لیے اپنے آپ کو فارغ کر دیں' وہ ہمہ وقت قرآن وحدیث کے مطالعہ میں غرق ہوں' جیسا کہ قرآن کریم میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ.....﴾ (التوبۃ:۱۲۲)

''سوایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تا کہ وہ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرے.....''

(۲) فقہاء متقی' پرہیز گار اور تقویٰ وطہارت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوں۔ یہ وہ اعلیٰ صفات ہیں جن سے انسان حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے' خواہشاتِ نفسانی سے دور رہتا ہے اور احکامِ الٰہی کو واضح کرنے میں ٹال مٹول سے کام نہیں لیتا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا.....﴾ (الانفال:۲۹)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تم کو ایک فیصلے کی چیز دے گا.....''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم کے ساتھ تقویٰ و پرہیز گاری اور اعلیٰ اخلاقی قدروں سے متصف ہونا بہت ضروری ہے۔ حضرت امام ترمذیؒ نے حضرت جبیر بن نفیر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث تخریج کی ہے جو حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کہ ہم لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے' کہ ایک مقام پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا کہ ''ایک وقت ایسا آئے گا کہ لوگوں سے علم اٹھ جائے گا' وہ لوگ کسی چیز پر قدرت نہیں رکھیں گے''۔ حضرت زیاد بن لبید الانصاری رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت فرمایا کہ ہم سے علم کس طرح اٹھ جائے گا؟ ہم لوگوں نے قرآن پاک پڑھا ہے اور اللہ کی قسم اس کی تلاوت کرتے رہیں گے اور اپنی خواتین اور بچوں کو بھی اس کی تعلیم دیتے رہیں گے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اے زیاد! تمہاری ماں تم کو نہ جنتی' میں تو تم کو مدینہ کے فقہاء میں شمار کرتا تھا' یہود و نصاریٰ بھی تو تورات و انجیل رکھتے ہیں اور ان کی تلاوت کرتے ہیں لیکن انہیں اس سے کیا فائدہ پہنچ رہا ہے؟'' حضرت جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب میں نے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی تو میں نے کہا کہ کیا آپ نے سنا کہ آپ کے بھائی حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کیا کہہ رہے ہیں؟ پھر میں نے ان کی بات انہیں گوش گزار کر دی تو حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ''ابوالدرداء صحیح کہہ رہے ہیں' اگر چاہو تو میں تمہیں بتاؤں کہ علم میں سب سے پہلے لوگوں سے خشوع اٹھ جائے گا' تم بھری مسجد میں دیکھو گے کہ ان میں ایک شخص بھی خشوع و خضوع والا نہیں ہوگا''(۱۷)

اس لیے ضروری ہے کہ جو لوگ اجتماعی اجتہاد میں شریک ہوں ان کے اندر دونوں مذکورہ شرائط موجود ہوں' ان کا انتخاب تفقہ فی الدین اور تقویٰ و پرہیز گاری کی بنیاد پر کیا جائے' وہ حکومت یا کسی سیاسی پارٹی کے دباؤ کا شکار نہ ہوں' وہ فیصلہ کرنے میں بااختیار ہوں اور وہ مشاورت میں کھلے ذہن سے شریک ہوں۔ وہ ہر تعصب سے پاک ہوں اور قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی رائے پیش کریں۔

موجودہ دور میں اجتماعی اجتہاد کے لیے متعدد اکیڈمیاں اور ادارے قائم کیے گئے ہیں۔ ان میں بعض حکومتی سطح پر کام کر رہے ہیں' جیسے سعودی عرب میں سربرآوردہ علماء بورڈ' پاکستان میں فکر اسلامی کونسل اور ہندوستان میں اسلامی فقہ اکیڈمی ہیں۔ اسی طرح بعض اکیڈمیاں بین الاقوامی سطح پر بھی قائم کی گئی ہیں' ان میں اسلامی کانفرنس تنظیم کے زیر اہتمام بین الاقوامی اسلامی فقہ اکیڈمی اور رابطہ عالم اسلامی کی فقہ اکیڈمی شامل ہیں۔ ان

اداروں اور اکیڈمیوں نے جدید مسائل کے حل کرنے میں اہم کردار ادا کیے ہیں۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان اکیڈمیوں اور اداروں کی قراردادوں کو اجماعِ اُمت کی حیثیت دے دی جائے' لیکن ہم ان کی تجاویز سے اتفاق نہیں کرتے۔ میں اداروں اور اکیڈمیوں کی علمی خدمات کا بہت زیادہ معترف ہوں' ان اداروں اور اکیڈمیوں نے اُمت کے بڑے بڑے مسائل حل کیے ہیں' لوگوں کو مشکلات سے بچایا ہے' جس کی وجہ سے وہ پوری اُمت کی جانب سے شکریے کے مستحق ہیں' تاہم ان کی قراردادوں کو اجماعِ اُمت کی حیثیت نہیں دی جانی چاہیے' اس لیے کہ اسلام اجتماعی اجتہاد میں ''کہنوتی نظام'' کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہماری روشن اسلامی تاریخ میں ایسا ایک بھی ادارہ نہیں پایا جاتا جس نے اجتہاد کا دروازہ دوسروں کے لیے بند کر دیا ہو' اسی وجہ سے امام مالکؒ نے اس بات سے انکار کر دیا تھا کہ لوگ ان ہی کے اجتہاد کی پابندی کریں۔ ابن سعد نے امام مالکؒ سے ایک روایت تخریج کی ہے' امام مالکؒ نے فرمایا کہ ''جب ابوجعفر منصور فریضۂ حج ادا کرنے ارضِ مقدس آئے تو انہوں نے مجھے طلب کیا' میں ان کے پاس آیا' مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس دوران انہوں نے کہا کہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ میں آپ کی کتاب ''موطا'' کے ذریعے فیصلے کروں' چنانچہ آپ اس کے متعدد نسخے تیار کریں تاکہ میں انہیں تمام شہروں میں بھیج دوں اور تمام لوگوں کو اس کے مطابق عمل کرنے کا حکم صادر کر دوں اور دوسری کتابوں کو ترک کر دیں۔ تو میں نے کہا: ''اے امیر المؤمنین! ایسا مت کریں' لوگوں کے پاس اللہ کے رسول ﷺ کی احادیث موجود ہیں' لوگ ان پر عمل کر رہے ہیں' اگر آپ ایسا کریں گے تو شدید اختلاف رونما ہو جائے گا' اس لیے انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔''(۱۸)

کسی فقہ اکیڈمی یا ادارے کے لیے ممکن نہیں کہ وہ پوری دنیا کے فقہاء کو جمع کر سکے' اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ دیگر فقہائے کرام کو اپنی آراء کا اظہار کرنے سے روک دیا جائے۔ جب یہ ممکن نہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی اکیڈمی یا ادارہ کی قراردادوں کا دوسروں کو پابند بنایا جائے' یا ان کی قراردادوں کو اجماعِ اُمت کی حیثیت دے دی جائے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ وہ قراردادیں نہایت مفید ہیں۔ جدید مسائل کو حل کرنے میں ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور ان کے مضبوط دلائل و براہین کو مرجعیت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب یہ قراردادیں شائع ہوں گی اور کسی نے اس کی مخالفت نہ کی تو خاص طور پر مذکورہ بالا مسائل پر اجماع کا راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ فقہ اکیڈمیوں اور اداروں کی قراردادیں ضرور شائع کی جانی چاہئیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ ایسا کرنے سے شاذ اور غیر شرعی فتوے صادر کرنے کا دروازہ بند ہو جائے گا' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک ادارے کے فتاویٰ کو تمام لوگوں پر لازم کرنا ممکن نہیں۔ اُمت کا ضمیر بیدار ہے اور اس نے شاذ اور غیر شرعی فتووں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ہماری تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی کمزور دلائل کی بنیاد پر فتوے صادر کیے گئے تو ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی اور آج وہ صرف صفحات میں موجود ہیں' لوگوں کی زندگیوں میں نہیں۔ (بشکریہ ''الحسن'' لاہور)

(حواشی صفحہ 34 پر)

رِسَالة فی بَیْعِ النَّسیئة

مدّت کے عوض قیمت میں اضافہ پر ایک تحریر

امام محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی
تحقیق وتخریج احادیث: عقیل بن محمد بن زید المقطری
ترجمہ وتلخیص: آصف علی

تعارف (امام شوکانیؒ کے توسط سے)

امام محمد بن اسماعیل الامیر الصنعانی کا سنِ پیدائش ۱۰۹۹ھ ہے۔ آپ مکہ کے شمال مشرق میں واقع ایک علاقہ کحلان میں پیدا ہوئے۔ اسی نسبت سے آپ کحلانی بھی کہلاتے ہیں۔ ۱۱۰۷ھ میں آپ کے والد آپ کو صنعاء لے گئے' آپ وہیں پلے بڑھے' علم وفضل کی بہت سی منزلیں وہیں طے کیں' پھر مکّہ اور مدینہ کے ممتاز شیوخ سے کسبِ فیض کیا۔ اس کے بعد صنعاء واپس آئے اور زندگی کے آخری لمحات تک اسی خطے میں درس وتدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

امام شوکانیؒ نے البدر الطالع میں آپ کے جن شیوخ کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت صنعاء اور حرمین میں موجود تھے اور ان میں سے ہر کوئی اپنے اپنے علم وفن میں یکتا تھا۔ آپ نے تفسیر' فقہ' حدیث' وراثت' بیان' معانی' منطق' صرف ونحو اور تجوید جیسے علوم میں بہت جلد مہارت حاصل کر لی۔

امام شوکانیؒ نے البدر الطالع میں آپ کے تقریباً آٹھ جلیل القدر شاگردوں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اپنے وقت کا منتخب مجتہد قرار دیا ہے۔

زہد وتقویٰ: آپ نے دنیا کو کبھی اپنا غم نہیں بنایا۔ لوگ آپ کی حق گوئی کی وجہ سے آپ کے مخالف ہو گئے۔ آپ کی شکایات حکمرانوں کے پاس لے جاتے' حتیٰ کہ آپ کو اتنی بار جیل جانا پڑا کہ مشہور ہو گیا کہ جیل تو آپ کا گھر ہے۔

کیا آپ زیدی تھے؟: امام شوکانیؒ کہتے ہیں کہ امام صنعانیؒ اپنے معاصرین کے حسد کا شکار ہوئے۔ لوگ آپ کے تبحرِ علمی سے جلتے تھے۔ آپ اپنوں میں تنہا ہو گئے۔ آپ کے بارے میں یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ آپ زیدی شیعہ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ دلیل سے بات کرتے تھے' چاہے وہ دلیل کہیں پائی جائے۔ امام شوکانیؒ آپ کو اہل سنت کے بڑے ائمہ میں شمار کرتے ہیں۔

مشہور کتب:

۱۔ سبل السلام شرح بلوغ المرام
۲۔ منحة الغفار حاشية على ضوء النهار
۳۔ التنوير شرح الجامع الصغير للسيوطی
٤۔ توضيح الافكار شرح تنقيح الانظار
٥ ۔ تطهير الاعتقاد عن ادران الالحاد
٦ ۔الايضاح والبيان
٧ ۔ الادلة الجلية فی تحريم النظر الی الاجنبية
٨۔ اجابة السائل شرح بغية الامل منظومة الكافل فی اصول الفقه

وفات: آپ نے ۸۳ سال کی عمر میں شعبان ۱۱۸۲ھ میں صنعاء ہی میں وفات پائی۔

آغازِ مضمون

تمام تعریفیں اس ذات کے لیے جس نے ہماری جہالت دور کی۔ درود وسلام ہو عرب وعجم کے سردار اور آپ ﷺ کے ساتھیوں پر جو علم وفضل کے بے کراں سمندر تھے۔ ایک سائل نے مجھ سے کچھ مسائل کے جوابات مع دلائل پوچھے ہیں۔ اللہ ان کا فائدہ عام کرے۔ ان سوالات میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وہ کون سے محکم دلائل ہیں جو بیع النسیئہ (اُدھار پر مہنگی فروخت) سے متعلق رہنمائی فراہم کریں' خاص طور پر ان حالات میں جب یہ لوگوں کی مجبوری بھی ہے اور خرید وفروخت کرنے والوں کی اکثریت اس میں ملوث بھی ہے۔ کیا اس کا تعلق کاروبار کی ان اقسام سے ہے جن پر نکیر واجب ہے یا گناہ ومعصیت کے لحاظ سے اس کا تعلق ان اقسام سے نہیں ہے؟ سائل نے جیّد علماء کرام کے دلائل کا بھی سَرسَری ذکر کیا ہے مگر سوال میں کیے گئے کلام کو دہرانے کی بجائے ہم نے اس کا تفصیلی جواب دے دیا ہے۔

ادھار پر بیچی جانے والی شے کی قیمت زیادہ وصول کرنے کے مسئلہ پر علماء کا کوئی واضح موقف موجود نہیں ہے جس سے باشعور لوگوں کے سامنے اس کا یہ حکم واضح ہو کہ اس مسئلہ کے حلال وحرام میں شامل ہونے کا مدار ربا کی حقیقت اور اس کی متفق علیہا ومختلف فیہا صورتوں کی معرفت پر ہے۔

سوال میں کی گئی گفتگو بھی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ حقیقت سود مختلف مسائل میں مختلف درجات پر زیرِ بحث آتی ہے۔ یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ بہت سی احادیث میں وارد ہونے والی چھ اجناس میں سود کی حرمت پر اُمت کا اجماع ہو چکا ہے۔ انہی میں سے ایک حدیث یہ بھی ہے جسے مسلم نے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''سونا سونے کے بدلے' چاندی چاندی کے بدلے' گندم گندم کے بدلے' جو جو کے بدلے' کھجور کھجور کے بدلے' نمک نمک کے بدلے' یہ سب ہم مثل ہوں اور معاملہ ہاتھ در ہاتھ ہو۔ جس نے زیادہ لیا یا دیا' اُس نے سودی معاملہ کیا' لینے والا اور دینے والا دونوں برابر ہیں۔''

یہ وہ چھ اجناس ہیں جن کے متعلق اجماع ہو چکا ہے کہ ان میں سے ہر جنس کی اپنے ہم جنس کے ساتھ بیع جائز نہیں ہے' جیسا کہ کھجور کی کھجور سے' مگر اس شرط کے ساتھ کہ عوضین ہم وزن ہوں اور معاملہ بھی ہاتھ در ہاتھ ہو [اگر یہ دو شرائط نہ پائی جائیں] تو یہ معاملہ سودی کہلائے گا۔

نصِ حدیث سے واضح ہے کہ یہ ربا الفضل اور ربا النسیئہ دونوں ہو سکتے ہیں اور ربا کی یہ وہ قسم ہے جس کے ربا ہونے پر اجماع ہے۔

یہاں اختلاف اس معاملہ میں ہے کہ دیگر اجناس کا الحاق ان چھ اجناس سے کیا جائے یا نہیں۔ اکثر ائمہ علم الحاق مع دیگر کے قائل ہیں' جبکہ کچھ علماء عدمِ الحاق کے قائل ہیں (یعنی ان چھ چیزوں کے علاوہ کسی شے میں بھی سود نہیں مانتے)۔ ہم اپنے رسالے ''القول المُجتبٰی فی مسائل الربٰی'' میں درست رائے کی نشاندہی کر چکے ہیں۔ الحاق کے قائلین کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ الحاق کس علت کی بنیاد پر ہوگا' جبکہ علّت کے مرکب ہونے پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ علت کے دو حصوں میں سے پہلا حصہ اشیاء کا ہم جنس ہونا ہے جبکہ دوسرا حصہ مختلف فیہ ہے۔ کچھ کے نزدیک [علت کا دوسرا حصہ] ان کا موزون و مکیل (قابلِ ماپ تول) ہونا ہے' جبکہ کچھ کے نزدیک ان کا اشیائے خوردنی ہونا' اور کچھ کے نزدیک ان کے ذخیرہ ہونے کی صلاحیت ہے۔

بہر حال اسی طرح کے مختلف اقوال امہاتِ کتب میں تفصیلاً درج ہیں۔ لہٰذا ان حضرات کے نزدیک جب تک مذکورہ بالا علت نہ پائی جائے نہ ان چھ اجناس میں سود پایا جائے گا اور نہ ان میں جن کا الحاق ان چھ اجناس کے ساتھ صحیح ہے۔ یہ درست ہے کہ ''کسی شے کو مدت کے عوض موجودہ قیمت سے زیادہ پر فروخت کرنے کا مسئلہ'' وضاحت طلب ہے' جیسا کہ ''ضوء النهار'' میں درج ہے کہ:

> ''یہ جواز اس صورت میں ہے جب عوضین جنس اور پیمانے میں مختلف ہوں۔ یہ وضاحت ایک تو اس لیے ضروری ہے کہ زید اور فریقین کے درمیان یہی صورت اختلافی ہے' دوسرے اس لیے کے ہر دو فریق کے درمیان اختلافی بیان میں تکرار سے بچا جائے' اور (واضح رہے کہ) ہم جنس اشیاء کے تبادلے میں کمی بیشی اور مدت کی تاخیر معتبر نہیں ہے۔''

اس سارے کلام سے یہ پوچھنا مقصود ہے کہ مذکورہ معاملہ میں سود نصاً یا علۃً پایا جائے گا یا نہیں؟ یعنی مذکورہ مسئلہ' مسائل ربا سے متعلق ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے' اور جیسا کہ سائل نے مثال دی ہے کہ ایک کپڑا ڈیڑھ سکے کا نقد بیچا جائے یا غلّے کا ایک پیمانہ ایک سکّے کا نقد اور ڈیڑھ کا قرض پر فروخت کیا جائے' تو مذکورہ بالا مسئلہ کے لیے یہ مثالیں بیان کرنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے مراد وہ بیع ہے جس میں عوضین جنساً و تقدیراً مختلف ہوں۔

لہٰذا عنوان یہ ہونا چاہیے کہ قیمت اور مبیع اگر جنس اور پیمانے کے لحاظ سے باہم مختلف ہوں تو کیا ادھار کے بدلے مہنگی شے بیچنا حرام ہوگا؟ باعث اختلاف یہی صورت ہے۔ علماء کے ایک گروہ نے اسے جائز کہا ہے جبکہ دوسرے نے حرمت کا فتویٰ دیا۔

مجیز (جائز کہنے والے): شے اور قیمت' جنس اور پیمانے میں الگ الگ ہیں اور کسی بھی قول کی رو سے ان میں ربا کی علت نہیں پائی جاتی۔ اور معاملات کی اصل حلّت ہے جب تک کوئی نہی وارد نہ ہو۔

مانع (منع کرنے والا): حرمت کی دلیل یہ ہے کہ ربا اصل میں بڑھوتری کا نام ہے اور یہاں پر بڑھوتری قیمت میں ہے جو مدت کے علاوہ کسی اور وجہ سے نہیں اور مدّت کا عوض نہیں ہوا کرتا۔

مجیز: یہ اضافہ اس وقت تک ثابت نہیں ہوتا جب تک دونوں اشیاء کی جنس ایک نہ ہو۔ جنس یا پیمانے کے جدا

ہونے کی صورت میں اسے ممنوع اضافہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کیونکہ قیمتیں ویسے بھی اجناس اور پیمانوں کی طرح مستحکم نہیں ہوتیں۔ لہٰذا اس معاملے میں قیمتوں کی کمی بیشی کوئی ایسی اصل نہیں جس کی طرف رجوع کیا جائے۔ رجوع مستقل اور دائمی اصول ہی کی طرف ہوتا ہے۔

مانع: یہاں اضافہ ثابت ہوتا ہے' کیونکہ یہ اضافہ قیمت پر ہے جس سے نقد سودا کیا جاتا ہے۔

مجیز: مگر یہ وہ اضافہ نہیں جسے شارع نے منع کیا ہے۔ انہوں نے اس اضافے سے روکا ہے جو ہم جنس کا ہم جنس پر ہو' جبکہ یہاں دونوں اجناس ہی جدا ہیں۔ اب اگر آپ یہ کہیں کہ ''مختلف'' ''متفق'' کی مانند ہوتا ہے تو یہ ایسا استدلال ہے جس پر صاحبانِ بصیرت کان ہی نہیں دھریں گے۔

مانع: یہ اضافہ وصول کرنا باطل ہے اور نصاً حرام ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

﴿لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (النساء:۲۹)

''ایک دوسرے کا مال باطل طریقوں سے مت کھاؤ۔''

مجیز: اس اضافہ پر بائع اور مشتری دونوں رضامند ہیں۔ آپ جس آیت سے استدلال کر رہے ہیں اس کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

''سوائے اس کے کہ تمہارا سودا باہمی رضامندی سے طے پائے۔''

مانع: ربا جس کی حرمت پر اجماع ہے باہمی رضامندی سے حلال ہو جائے گا؟

مجیز: کیوں نہیں' اگر سود کی حرمت پر کوئی نص موجود نہ ہوتی تو علی التحقیق حلال ہوتا۔ یہاں اضافہ بلا وجہ نہیں' مہلت پر ہے اور یہ خریدار کی ضرورت ہے۔ اضافہ اس نے اپنی ضرورت کے بدلے دیا ہے جبکہ اس کی ضرورت ''ادھار'' ہے' چاہے وہ یہ کام اشیاء خوردنی جلد حاصل کرنے کے لیے کرے یا کسی اور ضرورت کے تحت۔

مانع: امام بخاری نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اور انہوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا رِبَا اِلَّا فِی النَّسِیْئَةِ)) ''ربا تو ہے ہی قرض میں۔''

مجیز: یہاں نبی اکرم ﷺ کی مراد وہ سود ہے جو نص میں وارد ہونے والے چھ امور سے متعلق ہے' یا پھر قائلین الحاق کے نزدیک جس میں ان چھ والی علت پائی جائے' جبکہ ہمارا اختلاف ''ادھار پر مہنگی شے بیچنے'' پر ہے جو دونوں اقوال کے تحت ربا کی تعریف میں شامل نہیں ہے' مثلاً کپڑے کی نقد قیمت ایک سکّہ ہو اور ادھار پر دو سکّے تو وہ نص اور قیاس دونوں کے تحت ربا کے ذیل میں بالکل نہیں آئے گا۔ اسی طرح آپ حدیث بھی بے موقع لائے ہیں اور اس سے مراد بھی غلط لی ہے۔ اختلاف کرتے ہوئے آپ لفظ ''ربا'' میں الجھ گئے اور آپ نے سمجھا کہ شاید حدیث میں ''نسیئہ'' سے بھی یہی مراد ہے یا یہ مسئلہ بھی حدیث کے مفہوم میں شامل ہے' حالانکہ ایسا نہیں۔

مانع: ''البحر'' میں مصنف نے ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے محلِ نزاع کو اس حدیث سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ عَضُوْضٌ يَعُضُّ الْمُوْسِرُ عَمَّا فِيْ يَدِهٖ وَلَمْ يُؤْمَرْ بِذٰلِكَ))
''لوگوں پر ایسا سخت زمانہ آئے گا جس میں غنی بخیل ہوگا حالانکہ اسے یہ حکم تو نہیں دیا گیا ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۳۷)
''آپس میں فضیلت کو مت بھولو''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے بیع المضطر☆ ، بیع الغرر اور پھل پکنے سے پہلے ان کی بیع سے منع فرمایا ہے۔ ابنِ بہران کی تخریج میں اس حدیث کو مکمل طور پر بیان کرنے کے بعد صاحب تخریج نے لکھا ہے کے اس حدیث کو ابوداوٗد نے روایت کیا ہے۔

(حاشیہ از محقق) ☆ بیع مضطر: ابوداوٗد نے اپنی سنن (۳۔۶۷۶) میں حدیث (۳۳۸۲) کے تحت ''باب بیع مضطر'' میں کہا ہے:

((يَأْتِيْ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ عَضُوْضٌ يَعُضُّ الْمُوْسِرُ عَمَّا فِيْ يَدِهٖ وَلَمْ يُؤْمَرْ بِذٰلِكَ))
''لوگوں پر ایسا سخت زمانہ آئے گا جس میں غنی بخیل ہوگا حالانکہ اسے یہ حکم تو نہیں دیا گیا۔''

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:
﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ﴾ ''آپس میں فضیلت کو مت بھولو''
''رسول اللہ ﷺ نے بیع المضطر، بیع الغرر اور پھل پکنے سے پہلے ان کی بیع سے منع فرمایا ہے۔'' (ابوداوٗد)

احمد نے اس روایت کو اپنی مسند میں ہشیم کے طرق سے روایت کیا ہے، ھشیم نے ابو عامر المزنی سے انہوں نے بنو تمیم کے شیخ سے، پس یہ روایت انہوں (احمد) نے اسی انداز سے بیان کی ہے۔

ہم کہتے ہیں: یہ روایت شیخ تمیمی کے غیر معروف ہونے کی وجہ سے ضعیف ہے۔

جہاں تک بیع المضطر کی بات ہے تو اس کے متعلق شارح سنن ابی داوٗد (صاحب النہایۃ) نے النہایۃ میں کہا ہے کہ: یہ دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ کوئی کسی معاہدہ پر (خارجی) اکراہ کی وجہ سے مجبور ہو جائے تو یہ بیع فاسد ہوگی لہٰذا منعقد نہیں ہوگی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی پر کوئی قرض ہو یا وہ کسی بوجھ تلے دبا ہو اور (اس وجہ سے) وہ اپنی شے اصل قیمت سے کم پر فروخت کر دے۔ یہ راستہ اس نے مقروض ہونے کی وجہ سے اختیار کیا ہے جبکہ عزت داری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ (اپنی اشیاء) اس طرح فروخت نہ کرے۔ لیکن وہ شرمندگی اٹھاتا ہے اور خوشحالی کے انتظار میں قرض لے لیتا ہے، یا اچھے دنوں کی امید پر (ادھار پر) خریداری کر لیتا ہے، یا (حیثیت نہ ہونے کے باوجود) اصل قیمت پر سودا خرید لیتا ہے۔ تو ان وجوہات کی بنا پر اگر وہ انتہائی ضرورت کے تحت معاہدۂ بیع کرتا ہے تو اہلِ علم کے نزدیک بکراہت جائز ہے۔ یہاں (معاہدۂ بیع میں) بیع کا مطلب ہے خرید لینا، باہمی معاہدۂ بیع و شراء یا یک طرفہ اقرارِ بیع۔

بیع غرر کے متعلق خطابی کہتے ہیں: غرر کا اصل معنی ہے کہ: کسی چیز کا تمہیں علم نہ ہو یا اس کی حقیقت تم سے پوشیدہ ہو۔ عربوں کا قول ہے: ''طویت الثوب علی غرہ'' ''میں نے کپڑا تہہ کے نشان سے لپیٹا۔ یعنی اس کی سلوٹوں سے۔''

ہر وہ بیع جسے مجہول یا نا معلوم رکھنا مقصود ہو یا اسے پورا کرنے پر قدرت نہ ہو بیع غرر کہلاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بیع غرر سے منع اس اصول کے تحفظ کے لیے کیا ہے کہ لوگوں میں جھگڑا فساد نہ ہو۔ غرر کی کئی قسمیں ہیں۔ (عون المعبود)

رسول اللہ ﷺ کے قول (وبیع الثمرۃ قبل ان تدرك) کے بارے میں صاحب عون المعبود نے کہا ہے کہ: القاموس میں صاحب القاموس نے کہا ہے:
"وادرك الشيء بلغ وقته والمراد قبل أن يبدو صلاحها"
''چیز اپنی مدت کو پہنچی، یعنی پختگی ظاہر ہونے (کی مدت) سے تھوڑا پہلے (کے وقت کو پہنچی)۔''

مجیز: رسول اللہ ﷺ کے فرمان کا مقصد یہ خبر دینا ہے کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب غنی بخل سے کام لیں گے حالانکہ انہیں ہرگز اس کا حکم نہیں دیا گیا۔ یہاں صدقے پر ابھارا گیا ہے۔ آیت سے بھی ان کا استدلال غلط ہے اور یہاں بیع النسیئہ کا ذکر کہاں ہے؟

مانع: دلیل اس عبارت میں ہے:

((قد نهى رسول الله عن بيع المضطر))

''رسول اللہ ﷺ نے بیع المضطر سے منع کیا ہے۔''

اور نہی میں اصل تحریم ہوتی ہے۔

مجیز: ہم نہیں مانتے کہ بیع النسیئہ بیع المضطر ہے۔ بالفرض ہم یہ تسلیم کر بھی لیں تو بھی آپ مضطر کی خرید و فروخت کی صحت کے قائل ہیں' اس لیے آپ کا یہ استدلال نہیں بنتا جب تک کہ آپ بیع المضطر کی حرمت کے قائل نہ ہو جائیں' جو تا حال آپ نہیں ہیں۔ لہٰذا آپ کے لیے اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے۔

مانع: اللہ کے رسول ﷺ کا مال کے خرچ میں عفو و کرم پر اُبھارنا بھی ایک دلیل ہے اور تجارت بھی مال کے خرچ ہی کی ایک قسم ہے' جبکہ بیع النسیئہ دنیا کی محنت اور اس کی کثرت کی خواہش پر دلالت کرتی ہے۔

مجیز: اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ ہم اس معاملے کو حدیث کے تحت ایسے ہی لائیں جیسا کہ آپ کہتے ہیں (کہ اللہ کے رسول ﷺ کا مال کے خرچ میں عفو و کرم پر ابھارنا بھی ایک دلیل ہے) تو وہ یہ ہے کہ اس ارشادِ نبوی میں فضل و عطا کا تقاضا ہے نہ کہ وجوب و تحریم کا۔ پھر ہم یہ بھی نہیں مانتے کہ جس زمانے کی طرف اللہ کے رسول ﷺ نے اشارہ کیا تھا وہ آ چکا ہے۔ اور نہ ہی ہم آپ کی اس دلیل کو ثبوت کے بغیر مانتے ہیں کہ مذکورہ زمانہ وہی ہے جس میں بیع النسیئہ کی جائے گی' اور یہ تو بہت دُور کی کوڑی ہے۔

مانع: اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (البقرۃ:۲۷۵) ''اور اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔''

''البحر'' میں اسی سے استدلال کیا گیا ہے۔ ''البحر'' کے شارح کا کہنا ہے:

''آیت کی ظاہری دلالت یہ ہے کہ لغت میں ربا بڑھوتری کو کہتے ہیں لہٰذا ظاہراً آیت سے بیع میں ہونے والی ہر بڑھوتری کی حرمت ثابت ہوتی ہے سوائے اس کے جسے دلیل خاص کر دے۔''

مجیز: اس آیت سے استدلال ہمارے اختلاف کی نوعیت میں درست نہیں ہے' کیونکہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ''ادھار پر شے مہنگی فروخت کرنا'' ربا کے ذیل میں آتا ہے۔ لفظ ربا کا اطلاق اس صورت حال پر نہ ضمناً ہو سکتا ہے نہ التزاماً۔ اور آپ بھی اس پر ہم سے اتفاق کریں گے کہ اس مسئلے پر آپ کے نزدیک بھی لفظ ربا کا اطلاق نہیں ہوتا جب تک دونوں اشیاء جنس اور پیمانے میں ایک سی نہ ہوں۔

مذکورہ آیت ربا کے محل و مقام کے حوالے سے مجمل ہے جسے سنت نے چھ امور میں محدود کر دیا ہے' یا قائلین الحاق کے نزدیک دیگر جو بھی اشیاء ان (چھ) سے ملحق ہو سکیں۔ جہاں تک ہمارے اختلاف کی بات ہے تو وہ ان دونوں امور سے الگ ہے جیسا کہ پہلے گزر چکا۔ ''البحر'' کے شارح کا یہ قول کہ:

"الربا الزیادۃ لغۃ" ''لغت میں ربا بڑھوتری کو کہتے ہیں۔''

اور بڑھوتری سے مراد مبیع میں بڑھوتری ہے۔ اگر اس بڑھوتری سے مراد ہر طرح کا اضافہ ہے تو اس سے بیع مرابحہ وغیرہ کی حرمت بھی لازم آتی ہے۔ اور اگر مراد سودی اضافہ ہے تو اس کے لیے اس معاملے کا سودی محل و مقام (یعنی ان چھ اجناس یا علت کی بنیاد پر ان سے ملحق اشیاء) میں پایا جانا ضروری ہے جبکہ یہاں ایسا نہیں ہے۔

مانع: ﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ آیت ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ سے زیادہ خاص ہے' اس لیے اسے مقدم رکھا جائے گا۔ اسی کی طرف شرح ''البحر'' میں اشارہ کیا گیا ہے۔

مجیز: ہم واضح کر چکے ہیں کہ ﴿وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ نزاعی مسئلہ سے متعلق نہیں اور نہ ہی یہ مسئلہ ربا کے ذیل میں آتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے بیع کی وہ اقسام اس کے ذیل میں نہیں آتیں جن کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل ہے کہ وہ ربا کے لفظ کے تحت داخل ہے۔ لہٰذا یہ استدلال بھی درست نہیں۔

مانع: آیتِ ربا میں ممانعت ہے جبکہ آیت بیع میں اجازت ہے۔ اور حرمت تو اباحت پر مقدم ہوتی ہے۔ شارح ''البحر'' نے اس جانب بھی توجہ دلائی ہے۔

مجیز: اس کا جواب گزر چکا ہے کہ مسئلہ زیر بحث تحریم ربا کی آیت کے تحت نہیں ہے۔ ممانعت تو اس کی فرع ہے اور فرع تب درست ہوگی جبکہ اصل مسئلہ ربا کے لفظ کے تحت داخل ہو اور ایسا نہیں ہے۔ یہ دونوں دلائل جو سائل اور شارح ''البحر'' نے ذکر کیے ہیں ہم نے بھی تکمیل بیان کے لیے ذکر کر دیے ہیں' ورنہ یہ دلائل پہلے بھی گزر چکے ہیں۔

مانع: فرمان الٰہی ہے: ﴿تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ﴾ (النساء: ۲۹) جبکہ ہم جانتے ہیں کہ خریدار مرضی سے یہ سودا نہیں کر رہا اور وہ اس بیع میں آزاد مرضی سے شامل نہیں ہوا بلکہ مجبوراً ہوا ہے' لہٰذا یہ بیع مکرہ (مجبور کی بیع) سے مشابہ ہے۔

مجیز: معاملہ ایسا نہیں ہے۔ خریدار اختیار اور رضامندی سے سودا کرتا ہے۔ باشعور لوگوں میں معاہدے اسی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ چلو ہم مان بھی لیں کہ اس سودے میں اس کی رضامندی شامل نہیں' لیکن تمہارے نزدیک تو بیع مضطر صحیح ہے۔

مانع: سود میں بڑھوتری مدت کے بدلے ہوتی ہے۔ ادھار کا یہ معاملہ اسی کی مانند ہے۔ یہاں فرق کیا ہے؟

مجیز: یہ بے بنیاد دعویٰ ہے۔ سودی اضافہ تو حرام ہے چاہے نقد ہو اور یہ مدت کے بدلے بھی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر صرف ربا النسیہ ہی حرام ہوتا۔ مزید یہ بھی یاد رہے کہ تم لوگ ربا الفضل کی حرمت کے قائل ہو [اور ربا الفضل میں سود مدت کے بدلے نہیں ہوتا]۔

مانع: مجیز نے ﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ﴾ سے دلیل پکڑی ہے' لیکن ''البحر'' میں ہے کہ یہ آیت عام ہے لہٰذا سود کے خلاف ہے' یعنی اس سے استدلال درست نہیں' ورنہ اس آیت کے عموم کی بنیاد پر ربا کا جواز لازم آئے گا۔

مجیز: مذکورہ آیت ہر طرح کی بیع کی حلت پر دلالت کرتی ہے جبکہ آیتِ ربا' ربا کی حرمت پر نازل ہوئی ہے اور سنت نے اسے واضح کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ آیت عام سے خاص ہو گئی ہے۔ اور ادھار پر فروخت شدہ شے کا معاملہ اسی طرح آیتِ بیع کے عموم پر رہے گا جیسا کہ دیگر بیوع کا معاملہ ہے کہ جن کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں۔ آیت سے ہمارا استدلال مکمل ہوا جو آیت کی دلالت میں متفق علیہ اصول کے مطابق ہے کہ:

''تجارت کی حلت باہمی رضامندی میں ہے اِلّا یہ کہ کوئی دلیل اس اصول کو بدل دے۔''

اوراس اختلافی مسئلہ میں ابھی تک کوئی ایسی دلیل نہیں آئی جو اس اصل (یعنی حلت) کو حرمت کی طرف پھیر دے۔

مانع: اس طرح کی متنازع بیع کرنے والے لوگوں کی ضروریات کی گھات لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔ کشادگی اور ارزانی کے زمانہ میں یہ لوگ ذخیرہ اندوزی کر کے اس شے کے بیچنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

مجیز: اولاً: آپ کی یہ دلیل ''ادھار پر مہنگی شے فروخت کرنے'' کے معاملے میں ایک خاص نوعیت کی حامل ہے جو اشیاء خوردنی سے متعلق ہے' جبکہ آپ کا دعویٰ زیادہ عام تھا۔ آپ نے کپڑے کی مثال دی تھی جس میں مذکورہ صورت حال کا سامنا نہیں ہوتا۔ یہ دلیل دعویٰ کے ایک خاص حصے سے متعلق ہے۔

ثانیاً: مالک اپنی شے فروخت کرنے میں بااختیار ہوتا ہے جب چاہے اسے بیچنے کے لیے پیش کرے' اور آپ کی یہ بات کہ ''وہ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں'' ہماری بحث سے بالکل ایک الگ معاملہ ہے۔ ذخیرہ اندوز کی خرید و فروخت اصولاً صحیح ہے' کیونکہ نہی احتکار (ذخیرہ اندوزی) پر ہے نہ کہ ذخیرہ اندوز کی خرید و فروخت پر۔ ''البحر'' میں اس کی تصریح ہے کہ ذخیرہ اندوز کی خریداری درست ہے [اگرچہ ذخیرہ اندوزی حرام اور ممنوع ہے]۔ پھر یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بات دعویٰ کے محدود حصے سے متعلق ہے' کیونکہ ہر شے کی ذخیرہ اندوزی ممکن نہیں ہوتی۔ پس ہماری بات مکمل ہوئی۔ گزشتہ دلائل کا احاطہ کرنے کے بعد جان لینا چاہیے کہ بیع النسیئہ (ادھار پر مہنگی شے فروخت کرنا) جائز ہے اور اس کی حرمت پر کوئی دلیل نہیں۔

لہٰذا اس میں بیچنے والے اور خریدنے والے کو روکنا درست نہیں۔ اختلافی امور کو منکر نہیں قرار دینا چاہیے جیسا کہ اپنے اپنے مواقع پر واضح کیا گیا ہے۔ پس بیع النسیئہ کا انکار کرنے والا جاہل ہے۔ واللہ اعلم بالصواب! ☆

(حاشیہ از محقق)

☆ میں (عقیل بن محمد) کہتا ہوں: جہاں تک سنن ابی داؤد میں رسول اللہ ﷺ کے قول کا تعلق ہے کہ:

((من باع بیعتین فی بیعة فله اوکسهما اوالربا))

''جس نے ایک بیع میں دو سودے کیے وہ دونوں میں سے کم تر کو اختیار کرے' ورنہ سود ہوگا۔''

اس حدیث کے بارے میں منذری نے کہا ہے کہ اس کی سند میں محمد بن عمرو بن علقمہ ہے جس پر بہت سے محدثین نے جرح کی ہے۔ محمد بن عمرو سے جو روایت زیادہ مشہور ہے وہ دراوردی اور محمد بن عبداللہ الانصاری کے طرق سے ہے کہ: انه ﷺ نهی عن بیعتین فی بیعة ''رسول اللہ ﷺ نے ایک بیع میں دو سودے کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

خطابیؒ نے معالم السنن (۵۔۹۷) میں کہا ہے:

''میں فقہاء میں سے کسی کو نہیں جانتا جس نے اس حدیث کے ظاہر کے مطابق فتویٰ دیا ہو یا [ایک سودے کی] دو قیمتوں میں سے کمتر قیمت پر بیع کو صحیح کہا ہو سوائے ایک رائے کے جو اوزاعیؒ کی طرف منسوب کی جاتی ہے اور یہ ایک باطل رائے ہے' [فقہاء کا حدیث کے ظاہر کے مطابق فتویٰ نہ دینا] اس لیے ہے کہ اس طرح بیع میں دھوکا اور [شے کی حقیقت سے] لاعلمی [کا امکان ہو سکتا] ہے۔''

شوکانی نے نیل الاوطار میں لکھا ہے:

''یہ بات کچھ ڈھکی چھپی نہیں کہ اوزاعیؒ نے جو کہا ہے وہ حدیث کا ظاہری پہلو ہے کیوں کہ اس طرح کی بیع کے حکم سے یہ لازم آتا ہے کہ ایک سودے کی دو قیمتوں میں سے کمتر قیمت کو اختیار کرنے پر بیع کو صحیح مانا جائے۔''

(حاشیہ گزشتہ صفحہ سے)

◀◀ خطابی کہتے ہیں:

''محمد بن عمرو عن ابی سلمہ عن ابی ہریرۃ عن النبی ﷺ کی سند سے مروی مشہور متن درج ذیل ہے:
انه نهی عن بیعتین فی بیعة (آپ ﷺ نے ایک بیع میں دو سودے کرنے سے منع فرمایا۔)
یہ روایت ہم (خطابی) سے اصم نے انہوں نے ربیع سے انہوں نے شافعی سے انہوں نے دراوردی سے اور انہوں نے محمد بن عمرو سے —— اور [اسی طرح] یہ روایت ہم سے محمد بن ادریس الحنظلی نے بیان کی' انہوں نے اسے محمد بن عبداللہ الانصاری سے روایت کیا اور انہوں نے محمد بن عمرو سے۔
جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے جو بواسطہ یحییٰ بن زکریا محمد بن عمرو سے ابوداوٗد نے نقل کی ہے (جس میں **فله او کسهما او الربا** کے الفاظ ہیں) تو ایسا لگتا ہے کہ اس روایت میں بیان کیا گیا حکم ہم جنس شے سے متعلق ہے' جیسے ایک شخص نے کسی کو ایک دینار دیا تا کہ وہ ایک مہینے کے بعد اسے دو قفیز (غلے کا پیمانہ) غلہ دے۔ جب مدت گزری اور اس نے گندم طلب کی تو اس نے اسے کہا کہ: مجھے وہ دو قفیز' جو تیرے میرے ذمہ واجب الادا ہیں' مزید ایک ماہ کے لیے دو قفیز کے بدلے بیچ دو۔ دراصل یہ دوسری بیع ہے جو پہلی بیع پر داخل ہوئی لہٰذا اب یہ ایک بیع میں دو بیع کا معاملہ ہوگیا ہے۔ اب ان دونوں بیوع کو کم تر قیمت کی طرف لوٹایا جائے گا۔ اصول یہی ہے۔ اب اگر ان دونوں (قرض خواہ اور مقروض) نے قبل القبض دوسرا سودا کرلیا تو دونوں سودی معاملے میں ملوث ہو گئے۔''

میں (عقیل بن محمد) کہتا ہوں: النہایہ میں ابن اثیر نے یہی مفہوم بیان کیا ہے اور شوکانی نے بھی ابن رسلان سے اس طرح نقل کیا ہے۔

خطابی نے کہا ہے:

''ایک بیع میں دو سودوں کی ممانعت (والی حدیث) کا مفہوم دو طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ بائع کہے: میں نے یہ کپڑا تجھے دس کا نقد اور پندرہ کا ادھار پر بیچا' تو یہ جائز نہیں ہے' کیونکہ مالک نہیں جانتا کہ خریدار نے دو قیمتوں میں سے کونسی قیمت قبول کی ہے جس پر بیع واقع ہوتی اور جب قیمت مجہول ہو تو بیع باطل ہو جاتی ہے۔''

میں کہتا ہوں: یہی بات سماک نے کہی ہے اور امام احمدؒ نے ان سے اسی طرح نقل کیا ہے اور صاحب **المنتقی علی الموطأ** نے بھی نقل کیا ہے اور یہی مفہوم امام شوکانیؒ نے امام شافعیؒ سے بھی نقل کیا ہے۔

شوکانی کہتے ہیں:

''ابن الرفعۃ نے قاضی (عیاض) سے نقل کیا ہے کہ یہ مسئلہ اس مفروضے پہ قائم ہے کہ مشتری نے بائع کا ایجاب مبہم طور پر قبول کیا ہے' لیکن اگر مشتری یہ کہے کہ میں نے ہزار نقد پر یہ سودا قبول کیا یا پندرہ سو ادھار پر یہ سودا قبول کیا' تو یہ صحیح ہوگا۔

خطابیؒ نے کہا ہے:

اور دوسری صورت (جو ایک بیع میں دو سودوں پر نہی سے متعلق ہے) یہ ہے کہ بائع یہ کہے کہ میں نے اس شرط پر تمہیں یہ غلام بیس دینار کا بیچا ہے کہ تم اپنی لونڈی دس دینار میں مجھے بیچو گے۔ یہ بیع بھی بیع فاسد ہے' کیونکہ وہ غلام کی قیمت بیس دینار مقرر کر رہا ہے اور مشتری پر یہ شرط بھی عائد کر رہا ہے کہ وہ اپنی لونڈی بھی اسے دس دینار میں فروخت کرے' اور مشتری پر اس شرط کا پورا کرنا لازم نہیں' اور جب لازم نہیں ہے تو اس طرح قیمت کا ایک حصہ ساقط ہو جائے گا اور جب قیمت کا ایک حصہ ساقط ہو جائے تو باقی قیمت مجہول ہو جائے گی۔

◀◀

◀◀ اور اسی قبیل سے ہے کہ اگر وہ یہ کہے کہ میں نے یہ کپڑا تجھے اس شرط پر دو دینار کا فروخت کیا کہ تو مجھے ان دو دینار کے بدلے بیس یا تیس درہم بیع صرف کی صورت میں ادھار دے۔

لیکن جب مالک' خریدار کو دو چیزیں ایک قیمت پر فروخت کرے تو یہ جائز ہوگا' مثلاً گھر اور کپڑا یا غلام اور کپڑا۔ لہٰذا یہ ایک بیع میں دو سودوں کی نوع سے نہیں ہے۔ یہ ایک سودا ہے جس نے دو چیزیں ایک معلوم ثمن کے تحت اکٹھی کر دی ہیں۔ ایک بیع میں دو سودوں کی جو دو صورتیں ہم بیان کر آئے ہیں اکثر فقہاء کے نزدیک وہ دونوں صورتیں فاسد ہیں۔ طاووس سے روایت کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کہا ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ مالک' خریدار سے کہے کہ یہ کپڑا نقد دس کا ہے اور مہینے کے ادھار پر پندرہ کا' جبکہ خریدار دونوں قیمتوں میں سے ایک کو اختیار کر لے۔

میں (عقیل بن محمد) کہتا ہوں: النہایہ (لابن اثیر) میں ہے کہ: ایک بیع میں دو سودوں کی ممانعت (اس صورت میں ہے) کہ مالک کہے: میں نے یہ کپڑا تجھے دس کا نقد اور پندرہ کا ادھار پر بیچا اور اسے پتا نہ ہو کہ خریدار نے دونوں قیمتوں میں سے کون سی قیمت قبول کی ہے جس پر بیع واقع ہو۔ اور انہی ممنوع صورتوں میں سے ایک یہ ہے کہ مالک کہے: میں نے تجھے یہ شے اس شرط پر بیس کی بیچی کہ تو اپنا کپڑا مجھے دس میں بیچے گا۔ اس عقد میں یہ شرط صحیح نہیں ہوگی' لہٰذا اس شرط کے گرنے سے قیمت کا بعض حصہ گر جائے گا اور باقی قیمت مجہول ہو جائے گی۔ حالانکہ بیع اور شرط یا بیع اور قرض کو اکٹھا کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان دونوں صورتوں میں بیع و شرط یا بیع و قرض پایا جاتا ہے۔

میں کہتا ہوں: جہاں تک حدیث کے اس حصے کا تعلق ہے کہ ((فلہ او کسھما او الربا)) یعنی بائع کے لیے دونوں قیمتوں میں سے کم تر قیمت ہے یا پھر سود' تو اس کے بارے میں شوکانی نے نیل الاوطار میں کہا ہے کہ: حدیث کے اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ بائع اور مشتری اگر (ایک سودے کی) دو قیمتوں میں سے کمتر کو اختیار کرنے کی بجائے زیادہ کو اختیار کرتے ہیں تو وہ حرام کردہ سود میں پڑ گئے۔ یہی مفہوم ابن رسلان کی وضاحت سے بھی متبادر ہوتا ہے' لیکن اس حدیث کی وضاحت امام احمد نے سماک کے حوالے سے بیان کی ہے اور شافعیؒ نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے تو اس میں اس شخص کے لیے دلیل ہے جو اس موقف کا قائل ہے کہ ادھار کی صورت میں کسی شے کو نقد کے مقابلے میں زیادہ ثمن پر بیچنا حرام ہے اور یہ مسلک زین العابدین علی بن الحسین' ناصر' منصور باللہ' ہادویہ اور امام یحییٰ کا ہے' جبکہ شافعیہ' حنفیہ' زید بن علی' المؤید باللہ اور جمہور جواز کے قائل ہیں' کیونکہ اس بیع کے جواز کے دلائل میں عموم ہے اور یہ مذہب قوی ہے' کیونکہ ممانعت کی دلیل ابو ہریرہ ؓ سے مروی وہ پہلی روایت ہے جس کے راوی پر تنقید تم جان چکے ہو' مزید یہ کہ اسی راوی سے ایک اور روایت بھی مشہور ہے جسے کسی اور نے روایت کیا ہے اور اس روایت میں ''فلہ او کسھما او الربا'' کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ صرف یہ الفاظ ''نھی رسول اللہ ﷺ عن بیعتین فی بیعۃ'' ہیں' لیکن اگر ہم مان بھی لیں کہ روایت کا یہ ٹکڑا ''فلہ او کسھما او الربا'' نقل کرنے میں یہ راوی منفرد ہے' بطورِ حجت پیش کیا جا سکتا ہے' تب بھی اس کی ایسی تاویل ممکن ہے کہ جس سے اس روایت کو محلِ نزاع کے لیے بطور دلیل پیش نہ کیا جا سکے گا' جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ابن رسلان نے متنازع فیہ مسئلہ کے لیے اس روایت سے استدلال پر تنقید کی ہے۔ مزید یہ کہ اس روایت سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسی بیع ممنوع ہے جو اس صورت میں واقع ہو کہ بائع یہ کہے کہ: (یہ شے) نقد اتنے کی اور ادھار اتنے کی' لیکن اگر اس نے بیع کے شروع میں ہی کہا کہ: میں صرف ادھار اتنے پر بیچتا ہوں اور یہ قیمت شے کی موجودہ قیمت سے زیادہ (بھی) تھی (تو یہ معاملہ درست ہوگا)۔ حالانکہ اس روایت سے دلیل پکڑنے والے' مذکورہ صورت کو ممنوع قرار دیتے ہیں۔ اور حدیث اس پر دلالت نہیں کرتی۔ پس دلیل دعویٰ سے زیادہ خاص ہے۔

اور ہم نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے' جس کا نام ہم نے ''شفاء الغلل فی حکم زیادۃ الثمن لمجرد الاجل'' رکھا ہے۔ اس میں ہم نے اس مسئلہ کو خوب اچھی طرح واضح کیا ہے۔ ایک بیع میں دو سودوں کی حرمت کی ◀◀

◄◄ علّت قیمت کا عدمِ استحکام ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شے دو قیمتوں کے بدلے فروخت کر دی جائے۔ اور اس صورت کی حرمت کی علت کہ جس میں بائع اپنی کوئی شے کسی کو اس شرط پر بیچے کہ وہ بھی اپنی فلاں شے اس کو بیچے گا **التعلیق با لشرط المستقبل** ہے (اوپر بیان شدہ) گندم کے قفیز والی صورت میں بھی سود لازم آئے گا۔

میں (عقیل بن محمد) کہتا ہوں: اس سے تم پہ واضح ہو گیا ہو گا کہ اس مسئلے میں امام شوکانی' امام صنعانی سے متفق ہیں کہ: مدت کے بدلے شے کی قیمت میں اضافہ جائز ہے اور یہی مسلک حق ہے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا فتویٰ اسی کے مطابق ہے' جیسا کہ ان سے شیخ ابن عثیمین نے نقل کیا ہے۔ معاصرین میں سے اس مسئلے کے جواز پر شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز اور محمد بن صالح بن عثیمین نے بھی فتویٰ دیا ہے۔

(۱) شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز نے کہا ہے:

تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو اکیلا ہے اور درود وسلام ہو اس پر کہ جس کے بعد کوئی نبی نہیں' (درود وسلام ہو) اس کی آل پر اور اس کے صحابہ پر۔

بعد ازاں مجھ سے شکر کی بوری وغیرہ کی فروخت کے بارے میں سوال پوچھا گیا ہے جو ایک مدت کے ادھار پر ایک سو پچاس روپے کی ہے جبکہ اس کی نقد قیمت سو ریال کے برابر ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ: اس معاملے میں کوئی حرج نہیں' کیونکہ بیع نقد' بیع مؤجل نہیں ہے۔ اور مسلمان ہمیشہ سے اس طرح کا معاملہ کرتے آئے ہیں اور ان کا یہ معمول اس کے جواز پر اجماع کی مانند ہے۔ کچھ اہلِ علم نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے مدت کے بدلے زیادتی (وصول کرنے) سے منع کیا ہے اور اسے ربا سمجھا ہے۔ اس قول کی کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی اس معاملے کا تعلق ربا سے ہے' کیونکہ تاجر جب کسی خاص مدت تک کے لیے کوئی خاص شے فروخت کرتا ہے تو وہ اس مدت پر زیادہ نفع حاصل کرنے کی خاطر ہی راضی ہوتا ہے' جبکہ خریدار مہلت کے بدلے اور نقد ثمن کی ادائیگی سے عاجز ہونے کی وجہ سے زیادہ رقم دینے پر راضی ہوتا ہے۔ پس اس معاملہ میں دونوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ نبی ﷺ سے ایک روایت ہے جو اس (معاملہ) کے جواز پر دلالت کرتی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ نے عبداللہ بن عمرو بن العاص کو حکم دیا کہ وہ لشکر کا سامان تیار کریں تو وہ ادھار پر دو اونٹوں کے بدلے ایک اونٹ خریدتے تھے۔ مزید یہ کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے عموم کے تحت داخل ہوتا ہے کہ:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ﴾

''اے ایمان والو! جب تم ایک مقررہ مدت تک کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''

اور مذکورہ معاملہ اس آیت کے تحت داخل جائز مداینات (ہی) سے متعلق ہے۔ اور یہ بیع سلم کی نوع سے ہے۔ بیع سلم میں بائع اناج وغیرہ جیسی اجناس' جس میں سلم کا معاملہ شرعاً صحیح ہو' کو آج کی قیمت سے فروخت کرتا ہے جو عام طور پر اس قیمت سے کم ہوتی ہے جو مبیع (مسلم فیہ) کو حوالہ کرتے ہوئے ہوتی ہے اور اس کی (کم قیمت پر اناج فروخت کرنے) کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اس کو ثمن تو آج نقد مل رہی ہے جبکہ اس کو مبیع حوالے کرنے کے لیے مہلت مل رہی ہے اس سلم کے معاملے کی بیع مؤجل کے ساتھ معنوی مشابہت ہے۔ صرف اتنی بات ہے کہ بیع مؤجل میں مبیع نقد اور ثمن ادھار ہے جبکہ بیع سلم میں ثمن نقد اور مبیع ادھار ہے۔ جس طرح بیع سلم حاجت کی بنا پر جائز ہے اسی طرح بیع مؤجل بھی۔ بیع سلم میں مبیع میں زیادتی صرف قیمت نقد لینے اور مبیع بعد میں دینے کی وجہ سے ہے' بعینہٖ اسی طرح بیع مؤجل میں ثمن میں زیادتی مبیع نقد لینے اور ثمن بعد میں دینے کی وجہ سے ہے۔ (مزید تفصیلات کے لیے) کتاب دیکھو: **من احکام الفقه الاسلامی وماجاء فی المعاملات الربویه و احکام المداینة**' تألیف الشیخ عبداللہ بن جار اللہ ص ۲۹۔۳۱ ◄◄

◀◀ (۲) الشیخ محمد بن صالح بن عثیمین نے اپنے رسالے اقسام المداینة میں کہا ہے کہ:

مداینہ کی اقسام:

پہلی قسم: خریدار سودا خریدنا چاہتا ہے اور نقد دینے کے لیے اس کے پاس قیمت موجود نہیں ہے' وہ ایک مدت تک کے لیے حاضر قیمت سے زیادہ قیمت پر شے خریدتا ہے تو یہ جائز ہے۔ مثال کے طور پر وہ رہنے کے لیے یا کرایہ پر چڑھانے کے لیے ایک سال کے ادھار پر دس ہزار کا ایک مکان خریدتا ہے' جسے اگر وہ نقد خریدے تو اس کی قیمت نو ہزار ہے۔ یا وہ سواری کے لیے یا کرایہ پر چڑھانے کے لیے ایک سال کے ادھار پر دس ہزار کی ایک گاڑی خریدتا ہے' جسے اگر وہ نقد خریدے تو اس کی قیمت نو ہزار ہے۔ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کے تحت داخل ہوتا ہے کہ:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاكْتُبُوْهُ﴾

''اے ایمان والو! جب تم ایک مقررہ مدت تک کے لیے دَین کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔''

دوسری قسم: مشتری ادھار پر ایک سودا خریدے تاکہ اس سے تجارت کرے' مثلاً وہ ادھار پر موجودہ قیمت سے زائد قیمت پر گندم خریدتا ہے تاکہ اسے دوسرے شہر میں لے جا کر تجارت کرے یا بازار میں اس کی قیمت کے بڑھنے کا انتظار کرے یا اسی طرح کا کوئی اور معاملہ کرے تو یہ بھی سابقہ آیت کے تحت داخل ہونے کی وجہ سے جائز ہوگا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے ان دونوں قسموں کو کتاب وسنت اور اجماع (کی روشنی) میں جائز کہا ہے۔

(ابن قاسم نے مجموع الفتاویٰ میں اس کا ذکر کیا ہے ۲۹۔۴۴۹) ❁❁

بقیہ مضامینِ قرآن

سورۃ کے آخری رکوع میں ستاروں کے گرنے کی جگہ کی قسم کھا کر قرآن مجید کا ذکر بڑی عظمت کے ساتھ کیا گیا ہے۔ فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِیْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِیْمٌ ۝ فِیْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

''سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کی جگہ کی —— اور اگر تم سمجھو تو یہ ایک بڑی قسم ہے —— کہ بے شک یہ بہت عزت والا قرآن ہے' جو لکھا ہوا ہے ایک محفوظ کتاب میں۔ اسے وہی چھوتے ہیں جو پاک بنائے گئے ہیں (یعنی فرشتے)۔ اُتارا گیا ہے تمام جہانوں کے مالک کی طرف سے۔''

﴿ لَا یَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴾ کے ایک معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ ناپاکی کی حالت میں اس کلام پاک کو نہ چھوا جائے' اسے باوضو ہاتھ لگایا جائے' لیکن اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ جن کے اندر پاکی نہیں ہوتی' جن کا تزکیہ نفس نہیں ہو چکا ہوتا ان کی رسائی اس کتاب کے اصل مطالب تک نہیں ہو سکتی۔ ویسے تو یہ کھلی اور روشن کتاب ہے لیکن اس کے مطالب ومفاہیم تک رسائی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کی فکر ونظر کے اندر طہارت ہو' اس کی نیت درست ہو' اس میں طلبِ ہدایت پیدا ہو چکی ہو۔ ایسے لوگوں پر اس کے مطالب منکشف ہوتے چلے جائیں گے۔

آیات ۸۸ تا ۹۴ میں ایک مرتبہ پھر اجمالی طور پر بنی نوعِ انسان کے مذکورہ بالا تین گروہوں کا تذکرہ کیا گیا ہے' جبکہ اس سورۃ کی آخری آیت تسبیح وتحمید کے اعتبار سے بہت اعلیٰ شان والی ہے: ﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ﴾ ''پس آپ اپنے رب کے نام کے ساتھ تسبیح کیجیے جو سب سے بڑا ہے''۔ بعینہٖ یہی الفاظ اس سورۃ کی آیت ۷۴ میں بھی آئے ہیں۔ ❁❁

مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی وادبی خدمات

محمد انس حسّان ☆

حالات زندگی

مولانا ابوالکلام آزادؒ اپنی پیدائش اور جائے پیدائش سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ غریب الدیار عہد و نا آشنائے عصر و بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش' معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے' ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیٔ عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم ..... والد مرحوم نے تاریخی نام فیروز بخت رکھا تھا..... مولد و منشاءِ طفولیت وادی غیر ذی زرع عند بیت اللّٰہ المحرم ہے۔ یعنی مکہ معظّمہ زاد اللہ شرفاً وکرامۃً' محلّہ قدوہ' متصل باب السلام''۔ (۱)

مالک رام (عبدالمالک) کے نزدیک اگست کی ۱۶' ۱۷ یا ۲۲ تاریخ' مولانا کی تاریخ پیدائش ہے۔ مولانا غلام رسول مہر کے نزدیک ۱۶ یا ۱۷ اگست صحیح تاریخ ہے۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری کے نزدیک بھی اگست ہی میں ولادت ہوئی جبکہ قاضی عبدالغفار کے نزدیک ستمبر میں آپ کی ولادت ہوئی۔ حکومت ہند کے تحت چھپنے والی پروفیسر ہمایوں کبیر کی کتاب (Molana AbulKalam: A Memorial Volume) میں مطبوعہ تاریخ پیدائش ۱۱ر نومبر ۱۸۸۸ء دی گئی ہے' جو کسی بھی صورت درست نہیں' نامعلوم اس کا ماخذ کیا ہے۔ اکثریت ۱۶ یا ۱۷ اگست پر متفق ہے' لہٰذا اسی کو درست سمجھا جائے۔ (۲)

سات آٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۸۹۵ء میں والد کے ہمراہ ہندوستان چلے آئے۔ کلکتہ میں قیام کیا اور یہیں کے ہو رہے۔ اس لحاظ سے آپ کا مولد مکّہ معظّمہ اور متوطن ہندوستان ہے۔ پیدائش کے وقت نام محیّ الدین رکھا گیا۔ تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ آزاد تخلص کرتے تھے اور کنیت ابوالکلام تھی۔ مشہور ہوئے تو کنیت اور تخلّص ساتھ رہے' نام سب بھول گئے۔ ابتدا میں اپنے نام کے ساتھ ''دہلوی'' لکھا کرتے تھے۔ چند لوگوں کو آپ کے دہلوی ہونے پر کلام تھا' اس لیے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا کے نزدیک ان کے اجداد پشتوں سے دہلی میں رہتے تھے۔ اس لیے وہ ابتدا ہی سے اپنے آپ کو ''دہلوی'' لکھتے رہے۔ (۳) تذکرہ کے آغاز ہی میں مولانا نے نسب کے بت کو جس طرح توڑا ہے اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کے نزدیک نسب اور متوطن انسان کے لیے مشرف ہونے کا ذریعہ نہیں' صرف تقویٰ ہی انسان کی فضیلت کا باعث ہو سکتا ہے۔

۱۸۹۲ء میں جب مولانا کی عمر پانچ سال تھی تو حرم بیت اللہ میں عرب کے ایک عالم شیخ عبداللہ نے آپ کی

☆ استاد جامعہ قاسم العلوم' گلگشت کالونی' ملتان۔

تعلیم کے باقاعدہ سلسلہ کے لیے آپ کو بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم پڑھائی۔ پھر کچھ عرصے تک آپ کے والد محترم مولانا خیرالدینؒ خود پڑھاتے رہے۔ جب فارسی اور عربی کی ابتدائی کتب پڑھ لیں تو دہلی کے بزرگ عالم مولانا محمد یعقوبؒ کو آپ کی تعلیم کے لیے مقرر کیا گیا۔ فارسی وفقہ آپ کو اپنے والد پڑھاتے رہے اور مولانا محمد یعقوبؒ نے عربی و منطق پڑھانی شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا عبدالحق خیرآبادیؒ کے ایک شاگرد مولوی نذیر احمد امیٹھوی نے ''مطوّل''، ''شمس بازغہ'' اور ''رشیدیہ'' پڑھانی شروع کیں۔ مولانا نے باقاعدہ طالب علمی کا جو بھی زمانہ گزارا وہ اپنے گھر اور اپنے والد محترم کی خانقاہ ہی کے سایہ میں گزارا۔ چنانچہ آپ خود رقمطراز ہیں کہ ''انہوں (مولانا کے والد مولانا خیرالدین) نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے ان سے تعلیم دلائیں۔''(۴)

شمس العلماء مولانا سعادت حسنؒ سے بھی کچھ عرصہ شرفِ تلمذ رہا۔ والد محترم کے ہاں ایک خطاط حافظ بخاریؒ تھے، کبھی کبھار ان سے بھی سبق لیتے۔ ان کے علاوہ مولانا محمد شاہ محدثؒ حضرت جلال بخاریؒ کے خاندان سے تھے، ان کے درس کا چرچا سنا تو ان سے بھی دو ماہ ترمذی شریف کا درس لیا۔ اس کے علاوہ جامعہ ازہر مصر کے سید جمال الدینؒ اور شیخ عبدہٗ کی اجتہادی بصیرت و افکار سے بھی خوب استفادہ کیا۔ یہاں کی علمی صحبتوں اور تحریکات نے مولانا میں حب الوطنی کی روح پھونک دی، اور آگے چل کر یہ چیز الہلال والبلاغ کی اشاعت کا باعث بنی۔ لکھنؤ کے مشہور طبیب سید باقر حسین جو اُن دنوں اتفاقاً ایک سال کے لیے کلکتہ ٹھہرے ہوئے تھے، ان سے طب پڑھی، مگر طبیعت اس طرف آتی نہ تھی، اس لیے اسے ترک کر دینا پڑا۔

مولانا کو اپنے بچپن میں جس طرح کا گردوپیش میسر آیا اس میں اکثر بچوں کے بگڑنے کا امکان ہوتا ہے، اور اس طرح کے ماحول میں کسی نوعمر میں سرے سے کسی باعظمت شخصیت کی بنیاد ہی نہیں بنتی۔ جب اردگرد ہر طرف واہ واہ! اور جی حضوریاں ہوتی ہوں، ہر آنے والا قدموں پر ہاتھ رکھ کر سلام کرے، ہر کوئی پیرزادہ کی بلائیں لینے والا ہو تو وہاں پیرزادہ صاحب کی شخصیت، تکبّر، تن آسانی اور خوشامد پسندی کا مرقع بنتی چلی جاتی ہے، مگر مولانا کو اللہ تعالیٰ نے انوکھی طبیعت عطا فرمائی تھی۔ آپ بچپن ہی سے پیرزادگی، تن آسانی اور لہو ولعب سے متنفّر اور کبیدۂ خاطر تھے۔ مولانا نے خود اپنے وجدان کی راہنمائی سے اپنی شخصیت کی بنیادیں عظمت و عزیمت کے نقشے پر رکھیں۔ اس تناظر میں لکھتے ہیں:

> ''.....خلقت کا ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدت مندیوں کی شکل میں بغیر طلب وسعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخیت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمائش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدائشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے.....لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے دوسری ہی طرف لے جا رہی تھی۔''(۵)

مولانا کے اسی مکتوب کا ایک دوسرا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

''لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں' مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں..... کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرم کن شہر تھا۔ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی۔''(۶)

اسی خاص طبیعت کی یہ کرشمہ سازیاں تھیں کہ آپ نے رسمی تعلیم کے نصاب کی کتب بھی دستور طالب علمی سے ہٹ کر خود اپنی ذہنی صلاحیتوں کی پرواز کے مطابق رفتار سے پڑھیں۔ خود لکھتے ہیں کہ:

''تعلیم کی جو رفتار عام طور رہا کرتی ہے میرا معاملہ اس سے مختلف رہا..... اپنے بروقت استحضار اور اقتباسات سے نہ صرف طالب علموں بلکہ مولویوں کو بھی حیران کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھے بارہ برس کا لڑکا سمجھ کر بہت اڑتے تو میزان و منشعب کے سوالات کرتے۔ میں انہیں منطق کے قضیوں اور اصول کی تعریفوں میں لے جا کر ہکا بکا کر دیتا۔''(۷)

یہی عمر ہے جب مولانا شک و تذبذب کے گرداب میں ایسے پھنسے کہ ایک طویل عرصے تک اس سے خلاصی ممکن نہ ہو سکی۔ مولانا کو ابتدا ہی سے غور و فکر اور تحقیق و تدقیق کی عادت تھی جو آہستہ آہستہ ان کی فطرتِ ثانیہ بنتی چلی گئی' جوں جوں مطالعہ وسیع ہوتا جا رہا تھا توں توں مذہبی عقائد و افکار میں شکوک و شبہات کی راہ وسیع تر ہوتی جا رہی تھی۔ طبیعت کا حال یہ تھا کہ ہر لمحہ وہ کسی نئی حالت کے لیے مضطرب و بے چین تھی۔ اگرچہ یہ اپنے آبائی مذہب سے بغاوت کی پہلی سیڑھی تھی مگر اس کا انجام یہ ہوا کہ مذہب ہی سے بغاوت کر بیٹھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ:

''مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ابھی پندرہ برس سے زیادہ عمر نہیں ہوئی تھی کہ طبیعت کا سکون ہلنا شروع ہو گیا تھا اور شک و شبہ کے کانٹے دل میں چبھنے لگے تھے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جو آوازیں چاروں طرف سنائی دے رہی ہیں' ان کے علاوہ بھی کچھ اور ہونا چاہیے اور علم و حقیقت کی دنیا صرف اتنی ہی نہیں ہے' جتنی سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔ یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی۔ یہاں تک کے چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان' تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں' بہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں' اور پھر وہ وقت آیا کہ اس ہلتی ہوئی دیوار کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا کر اس کی جگہ نئی دیواریں چننی پڑیں۔''(۸)

مذکورہ بالا اقتباس پڑھ کر بعض دفعہ کوئی سطحیت پرست و جلد باز یہ سمجھنے لگتا ہے کہ شاید یہ تو مذہب کی حقیقت و اہمیت پر کوئی حرف گیری ہے۔ حاشا و کلا ایسا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ایک انسان جب شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو اگر اس کی عقل کام کرتی ہے تو وہ ضرور اپنی معلومات کو اپنے مشاہدات سے تطبیق کے مرحلہ سے گزرتا ہے اور پھر وہ انسان جس نے آگے چل کر اپنے دور کے لوگوں کی فکری راہنمائی کے منصب پر فائز ہونا ہو' اس کے لیے قدرت خود اس کا سامان کرتی ہے کہ جو پیغام اس نے کل کو اپنی قوم کے سامنے رکھنا ہے اسے خود اس پر شرح صدر کا درجہ حاصل ہو اور وہ اپنے دور کے معروضی حالات میں قوم کو واضح و دوٹوک رہنمائی فراہم کر سکے' تاکہ کل جب وہ قوم کے سامنے یہ دعویٰ رکھے کہ تمہاری بگڑی ہوئی صورتِ حال کے سنوارنے کا نسخہ یہ دین ہے تو اس میں اسے نہ کوئی

جھجک ہو نہ ابہام۔ چنانچہ مولانا خود لکھتے ہیں:

''میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں' اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیے ہیں' میں جب پیاسا تھا تو میری تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہِ عام پر نہ تھا۔''(۹)

یہی وجہ ہے کہ مولانا نے جب دعوت وتذکیر کے میدان میں قدم رکھا اور قوم کے سامنے اپنا پیغام رکھا تو دعوت پر کان لگانے والوں نے یہی محسوس کیا کہ یہ تو ہمارا ہی وہ سبق ہے جو ہم گردشِ زمانہ کی بھول بھلیوں میں گم کر بیٹھے تھے۔ اور اس بات کو یوں بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ مفتیٔ وقت اور مستفتی کے یقین واذعان کا جو فرق ہے' آخر وہ کیا ہے؟ یہی کہ مستفتی پیش آمدہ کسی بھی معروضی صورتحال کے شرعی حکم پر اس لیے یقین رکھتا ہے کہ مفتیٔ وقت کا فتویٰ یہی ہے اور مفتیٔ وقت جو حکم بتاتا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ اسلام کے اصول کی روشنی اسے یہی دکھا رہی ہے۔ حکم ایک ہے' لیکن اس کے مان لینے کی کیفیت میں فرق ہے۔

ایک طویل عرصے تک مولانا شکوک وشبہات کے اس گرداب میں بھٹکتے رہے اور بالآخر قرآنِ مجید کی حقیقی تعلیمات نے مولانا کے ذہن میں اٹھنے والے تمام سوالات کے جوابات دے دیے۔ قرآنِ مجید کے اس مطالعہ نے مولانا کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب برپا کر دیا' اور وہ ہر چیز کو منطقی وفلسفی نقطۂ نگاہ سے پرکھنے اور ان کے دلائل سے متاثر ہونے کی بجائے قرآن کی فطری اور سادہ تعلیمات ہی کو حجت تسلیم کرنے لگے۔ مگر شکوک و شبہات کی اس طویل صحبت کا یہ فائدہ بھی ہوا کہ مولانا اپنے موروثی عقائد اور تقلیدی ایمان ہی پر قانع نہیں رہے' بلکہ انہوں نے اپنے لیے خود علم وفن کی نئی جہتیں اور راہیں نکالیں اور اسلامی تعلیمات کی روحانی اور ابدی سچائی کو اپنے اس طویل تحقیقی سفر کے نتیجے میں آخر کار پا لیا۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''بالآخر حیرانگیوں اور سرگشتگیوں کے بہت سے مراحل طے کرنے کے بعد جو مقام نمودار ہوا اس نے ایک دوسرے ہی عالم میں پہنچا دیا۔ معلوم ہوا کہ اختلاف ونزاع کی انہی متعارض راہوں اور اوہام وخیالات کی انہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے' جو یقین اور اعتماد کی منزلِ مقصود تک چلی گئی ہے۔ اور اگر سکون وطمانیت کے سرچشمے کا سراغ مل سکتا ہے تو وہیں مل سکتا ہے۔ میں نے جو اعتقاد حقیقت کی جستجو میں کھو دیا تھا' وہ اس جستجو کے ہاتھوں پھر واپس مل گیا۔ میری بیماری کی جو علت تھی وہی بالآخر داروئے شفا بھی ثابت ہوئی..... البتہ جو عقیدہ کھویا تھا' وہ تقلیدی تھا' اور جو عقیدہ پایا وہ تحقیقی تھا۔''(۱۰)

مولانا کے والد کے ایک مرید مولوی آفتاب الدین تھے' جو تمام عمر سروے آفس کلکتہ میں ملازم رہے' سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جا ملتا تھا۔ آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کر کے ہندوستان آن بسا تھا۔ اللہ نے ایک بیٹے اور پانچ بیٹیوں سے نواز رکھا تھا۔ ان میں سے ایک کی شادی مولانا کے بھائی ابونصر آہ سے ہوئی' جبکہ سب سے چھوٹی بیٹی زلیخا مولانا آزاد کے ساتھ بیاہی گئیں۔ بوقت شادی مولانا کی عمر بارہ سال اور زلیخا بیگم کی عمر نو سال تھی۔ مولانا کی ہمشیرہ آرزو بیگم کی روایت کے مطابق مولانا اتنی سی بات پر رو پڑے کہ انہیں زنان

خانے میں لے جایا جا رہا ہے۔ مولانا کا سسرال قریب میں ہی واقع تھا' جس کی بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ مولانا کے سیاسی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اکثر وقت قید و بند کی صعوبتوں میں گزرتا تھا' جس کے باعث گھر خالی رہتا۔ ان حالات میں انہی لوگوں سے گھر میں چہل پہل قائم رہتی۔

زلیخا بیگم کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''زلیخا بیگم نے اپنی تمام زندگی ایک آئیڈیل بیوی کی طرح گزاری۔ مولانا کے فقر و فاقہ میں شریک رہیں اور خوشحالی کا دور شاذ ہی دیکھا۔ مولانا گھر میں نہ ہوتے' فون آتے تو ریسور نہ اٹھاتیں[11] مولانا خود ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار''۔[12]

مولانا کا انتقال ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء رات سوا دو بجے ہوا۔ مولانا کے دیگر رفقاء کی طرح جواہر لال نہرو کا بھی یہی خیال کہ مولانا تمام زندگی عوام سے کھچے رہے لہٰذا ان کے جنازہ میں بھی خواص ہی ہوں گے۔ مگر ان کے انتقال کی خبر سنتے ہی دو لاکھ کے قریب لوگوں کا مجمع مکان کے باہر جمع ہو گیا۔ ہر کوئی غمزدہ تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر حزن و ملال تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دہلی شہر کا تمام کاروبار بند ہو گیا۔ ایسی ہڑتال دہلی کی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملی۔

جنازہ ان کے اسی مکان سے اٹھایا گیا۔ پہلا کندھا عرب ممالک کے سفراء نے دیا۔ اس موقع پر جواہر لال نہرو' جنرل شاہ نواز' خان محمد یونس خان' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اور راجندر پرشاد وغیرہ بھی موجود تھے۔ ہر ایک غم کا پیکر بنا مولانا کی میت کو دیکھ رہا تھا۔ پنڈت پنت نے درد سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا: ''مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔''

بھارتی فوج کے چیف آف سٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے اور صدر جمہوریہ و نائب صدر کی گاڑی جنازہ گاڑی کے پیچھے تھی۔ جنازہ کو پریڈ گراؤنڈ میں لیجایا گیا' جہاں محتاط اندازے کے مطابق پانچ لاکھ لوگ جمع تھے۔ سبحان الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی اقتدا میں ٹھیک دو بجکر پچاس منٹ پر نمازِ جنازہ ادا کی گئی۔ شورش کاشمیری کے مطابق مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تحریک پر لال قلعہ اور جامع مسجد کے قلب کی پریڈ گراؤنڈ میں سرمد شہید کی قبر کے عقبی میدان کو قبر کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہیں دفن کیے گئے۔ مولانا احمد سعید نے قبر میں اتارا اور سفید کھدر میں لپٹا ایک قیمتی وجود زمین کے سپرد کر دیا۔ مولانا کی قبر جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان بنائی گئی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے شورش کاشمیری لکھتے ہیں:

''راقم الحروف کا یہ عقیدہ ہے کہ اقبال اور ابوالکلام اس صدی کے بہت بڑے مسلمان اور عبقری دماغ تھے۔ دونوں کا سیاسی میدان ہمیشہ ہی مختلف رہا' لیکن عوام کی بھیڑ سے کنارہ کیا۔ اقبال کو شاہی مسجد لاہور کے پہلو میں جگہ ملی..... ابوالکلام کو جامع مسجد اور لال قلعہ کے درمیان قلب میں جگہ ملی کہ مولانا دونوں عمارتوں کے شکوہ کی انسانی تصویر تھے''۔[13]

مولانا کی سیاسی خدمات

ابتدا میں مولانا تشدّد کے قائل تھے اور اسلامی نظام کے نفاذ کا واحد ذریعہ اسی کو سمجھتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد حکومت برطانیہ کا مسلمانوں کے ساتھ وہ ظالمانہ و سفاکانہ

برتاؤ تھا' جس نے مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کے بچے کھچے آثار مٹا ڈالنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا۔ یہی وہ بنیادی وجوہات تھیں جنہوں نے اول روز ہی سے انگریز سامراج کے خلاف بغاوت کا لاوا مولانا کے رگ وپے میں دوڑا دیا تھا۔ اگر ''ہماری آزادی'' واقعی مولانا آزادؒ کی کتاب ہے[۱۴] تو اس کے مطابق غالباً ۱۹۰۷ء کے اواخر اور ۱۹۰۸ء کے آغاز میں مولانا مصر' شام' ترکی اور فرانس کی سیاحت کو نکلے تھے۔ لندن جانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ یکا یک والد ماجد کی علالت کی خبر سن کر واپس ہندوستان لوٹ آئے۔ ان ہی اسفار میں بین الاقوامی سیاسی تحریکات اور ان کے نتائج وعوامل پر غور وفکر کرنے کا موقع ملا۔ مصر میں ان دنوں شیخ جمال الدین اور شیخ عبدہ کی تحریک کا خوب غلغلہ تھا۔ کہیں نظر سے گزرا ہے کہ مولانا نے درسِ نظامی کی تکمیل انہی ایام میں جامعہ ازہر سے کی۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً شیخین کی اجتہادی سوچ اور علمی وسیاسی بصیرت سے ضرور مستفید ہوئے ہوں گے۔[۱۵] اس کے علاوہ عراق اور ترکی کے انقلابیوں سے بھی روابط بڑھے' اور اصلاً انہی انقلابی تحریکات نے مولانا میں انقلاب کی روح پھونک دی اور وہ ہندوستان ایک عظیم مشن لے کر لوٹے' یعنی ہندوستان سے انگریز سامراج کا مکمل انخلاء۔ ''ہماری آزادی'' میں مولانا نے اپنے اس طویل سفر اور اس کے مشاہدات ونتائج کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے' لکھتے ہیں:

> ''جب میں عراق گیا تو وہاں چند عراقی انقلابیوں سے ملاقات ہوئی۔ مصر میں مصطفیٰ کمال پاشا کے پیروؤں سے کچھ تعلقات پیدا ہوئے۔ ان کے علاوہ میں ینگ ٹرکس کے گروپ سے بھی ملا..... جب میں ترکی گیا تو ینگ ٹرکس تحریک کے چند لیڈروں سے دوستی ہوگئی' ہندوستان واپس آنے کے کئی سال بعد تک ان سے خط وکتابت جاری رہی۔ عرب اور ترک انقلابیوں سے تعلقات ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ میرے سیاسی عقائد راسخ ہوگئے..... مجھے اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں ایک نئی تحریک شروع کی جائے اور میں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان واپس جا کر زیادہ انہماک کے ساتھ سیاسی جدّوجہد کروں گا۔''[۱۶]

اب اس سیاسی جدّوجہد کے خدوخال کیا ہوں گے؟ اور ہندوستان جیسی غلامانہ سلطنت میں اس کا طریق کار اور حکمتِ عملی کیا ہوگی؟ اس بارے میں مولانا لکھتے ہیں کہ ''ہندوستان واپس آ کر میں کچھ دنوں غور کرتا رہا کہ مجھے کیا طریق اختیار کرنا چاہیے اور کیا پروگرام بنانا چاہیے؟ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی موافقت کے لیے رائے عامہ پیدا کرنا چاہیے اور اس کے لیے ایک اخبار جاری کرنا ضروری تھا۔ ''الہلال'' اسی غور وفکر کا نتیجہ تھا۔''[۱۷]

مولانا آزادؒ نے ہندوستان واپس آ کر ''الہلال'' کے ذریعے ان سب تحریکات کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا اور اسے عوام کی آواز بنا دیا۔ اسی دور میں مولانا محمد علی جوہر کا ''کامریڈ'' اور مولانا ظفر علی خان کا ''زمیندار'' بھی پوری آب وتاب سے نکلا اور یوں ان تینوں اخباروں نے مل کر ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار عوام کو آزادی کے حقیقی مفہوم سے روشناس کروایا اور ان میں براہِ راست اس تحریک میں عملی کردار ادا کرنے کا داعیہ پیدا کیا۔

اس مختصر سے سیاق وسباق کے بعد اب مولانا اور ''الہلال'' کے باہمی سفر کا جائزہ لیتے ہیں۔ ''الہلال'' کے اجرا سے پہلے مولانا کی کوئی خاص پہچان نہیں تھی اور نہ ہی وہ ہندوستان کے صف اوّل کے رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ ''الہلال'' نے مولانا کو امام الہند بنا دیا' اور ان کی آواز اور دعوت پر پورا ہندوستان ہمہ تن گوش

ہوگیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے الفاظ ہیں کہ ''ہم اپنا سبق بھول چکے تھے' الہلال نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلایا''۔ شورش کاشمیری مرحوم لکھتے ہیں:

''..... یہ حقیقت ہے کہ الہلال سے بڑا ہفتہ وار آج ۶۱ برس بعد بھی اردو صحافت پیش نہیں کر سکی[۱۸] نہ اتنا بڑا مجلّہ' نہ اتنا بڑا ایڈیٹر اور نہ اتنا بڑا ذہنی' علمی' تاریخی فکری اور جذباتی صحیفہ۔ لوگ پڑھتے تو سر دھنتے اور دیکھتے تو مست ہوتے تھے۔ اس کی خوبیاں اس کے ساتھ ختم ہوگئیں' وہ پرچہ نہیں ایک عہد تھا' ایک تاریخ تھا' ایک انجمن تھا' ایک تحریک اور ایک اکادمی تھا۔''[۱۹]

اپنے طویل سفر سے واپسی کے بعد اگرچہ مولانا مختلف رسائل و جرائد سے وابستہ رہے' مگر جو جذبات و احساسات مولانا کے دل میں موجزن تھے' ان کے اظہار کے لیے ایک ایسے جریدہ کی ضرورت تھی جو مولانا کی بلندیٔ فکر کا ساتھ دے سکے۔ چنانچہ ۱۳؍جولائی ۱۹۱۲ء کو یہ خواب ''الہلال'' کی شکل میں شرمندۂ تعبیر ہوا' اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پورے ہندوستان کو اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ مولانا نے ''الہلال'' انتہائی غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد جاری کیا تھا۔ مولانا یہ فیصلہ تو اس کے اجرا سے پہلے ہی کر چکے تھے کہ ہندوستان کو فرنگی تسلّط سے آزاد ہونا چاہیے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بخوبی جانتے تھے کہ اس فیصلہ پر عملی قدم اٹھانا بچوں کا کھیل نہیں اور یہ وہ راستہ ہے جس کے چپے چپے پر کانٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب تک ہندوستان میں انفرادیت سے ہٹ کر اجتماعی بنیادوں پر جذبۂ وطنیت پیدا کر کے مذہب و قوم کے اختلاف کو نہ مٹایا جائے تو آزادی کا حصول کسی صورت ممکن نہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں چند اخبارات کو عوامی اخبارات ہونے کا اعزاز حاصل ہوگیا تھا' مگر ان اخبارات کی زیادہ تر توجہ قومی و بین الاقوامی سیاست اور ان کے نتائج و عوامل کی بجائے ذاتی و فروعی مسائل تک محدود تھی' اور ملکی سیاست میں کسی فعال تحریکی کردار کی توقع ان میں سرے سے مفقود تھی۔ مذہبی اور سیاسی زندگی کو دو مختلف وظائف سمجھ لیا گیا تھا اور یہی موضوعات ہمارے بھائیوں کی فکر و نظر اور دعوت و تذکیر کی انتہائے معراج تھے۔

ان گوناگوں حالات میں ''الہلال'' کی سیاسی و مذہبی تعلیم نیز اس کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے؟ اس کا تذکرہ مولانا نے ''الہلال'' ۸؍ستمبر ۱۹۱۲ء کے اداریے میں کیا ہے۔ چنانچہ مولانا نے لکھا ہے:

''(۱) ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو قرآن ہی ہے' اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے۔

(۲) ہم نے تو اپنے پولیٹیکل (سیاسی) خیالات مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ وہ مذہبی رنگ ہی میں نہیں بلکہ مذہب کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ ہم انہیں مذہب سے کیونکر علیحدہ کر دیں؟ ہمارے عقیدہ میں ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو ایک کفر صریح ہے اور پالیٹکس بھی اس میں داخل ہے۔

(۳) قرآن سامنے ہوتا تو نہ گورنمنٹ کے دروازے پر جھکنا پڑتا نہ ہندوؤں کے اقتدار کی ضرورت پیش آتی۔ اسی سے سب کچھ سیکھتے جس کی بدولت تمام دنیا کو سب کچھ سکھایا ہے۔

(۴) اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا ہے۔

(۵) الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول ﷺ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے' خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی یا سیاسی ہوں' خواہ اور کچھ ہو۔ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔

(۶) اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لیے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹیکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں' وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں داخل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلنے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ نہیں صرف خدا کے ساتھ ہیں۔

(۷) الہلال کی پالیٹکس میں یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد رکھئے نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہوئیے۔ صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے''(۲۰)

''الہلال'' اپنے ان اغراض و مقاصد میں کافی حد تک کامیاب ہوا اور اس کی شہادت ان تاریخی شخصیات کی آراء ہیں جن کی زندگیوں کو الہلال نے یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی رائے پہلے نقل کی جا چکی ہے کہ ہم اپنا سبق بھول چکے تھے' الہلال نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا۔ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ جیسی نادر الوجود شخصیت نے کئی بار اس کا برملا اظہار کیا کہ اگر ابوالکلام نہ ہوتے تو ہندوستان میں مسلمانوں کا انقلابی سفر دیر تک معطل رہتا(۲۱) مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ فرماتے تھے کہ مجھے سیاست کا چسکا الہلال نے ڈالا۔ شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اگرچہ مولانا سے مختلف سیاسی راستے پر تھے لیکن وہ بھی یہ کہتے تھے کہ مولانا آزاد نے سیاسی آواز کو دینی لہجہ دے کر اس زمانے کے علماء کو خطابت کا ایک نیا اسلوب دیا اور اس یگانہ اسلوب کے سحر میں کسی کو اختلاف نہیں۔ میں نے ابتداءً خود الہلال کی خوشہ چینی کی ہے(۲۲) مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ نوجوان مسلمانوں میں قرآن پاک کا ذوق مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال اور البلاغ نے پیدا کیا اور جس اسلوبِ بلاغت' کمال انشا پردازی اور زورِ تحریر کے ساتھ انہوں نے انگریزی خوان نوجوانوں کے سامنے قرآن پاک کی ہر آیت کو پیش کیا اس نے ان کے لیے ایمان و یقین کے نئے نئے دروازے کھول دیے اور ان کے دلوں میں قرآن پاک کے معنی اور مطالب کی بلندی اور وسعت کو پوری طرح نمایاں کر دیا(۲۳) چوہدری افضل حقؒ جو احرار کے شاہ دماغ سمجھے جاتے تھے' اپنی زندگی میں برپا ہونے والی تبدیلی کا محرک الہلال کی جوشیلی اور غیورانہ تحریروں کو قرار دیتے تھے۔

مولانا محمد علی جوہرؒ خود ان دنوں ''ہمدرد'' نکال رہے تھے اور معاصر اخبار ہونے کی حیثیت سے دونوں اخبارات کے مابین اکثر رقیبانہ چشمک بھی رہتی تھی' لیکن اس کے باوجود مولانا جوہرؒ نے جن الفاظ میں ''الہلال'' کی علمیت' جامعیت اور ہمہ گیری کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

''جب الہلال کو اور فروغ ہوا تو میں نے علوم مذہبی میں اپنی کم مائیگی کو اسی کے مضامین پڑھ پڑھ کر بہرہ اندوزی سے بدلنے کی کوشش کی اور یہ سلسلہ ''البلاغ'' کی اشاعت کے بعد پھر چندوڑہ کی نظر بندی میں

جاری رکھا گیا۔''(۲۴)

علامہ انور شاہ کشمیریؒ بھی الہلال کے بڑے مداح تھے۔ اگرچہ حضرت علامہ میدانِ علم کے نامور شاہسوار تھے لیکن میدانِ سیاست سے انہیں کوئی خاص موانست نہ تھی۔ اس کے باوجود الہلال کی دعوت اور ہندوستان کے غلامانہ دور میں اس کی آزادی وحریت کے خوب معترف تھے۔ فرماتے تھے: ''ابوالکلام نے الہلال کا صور پھونک کر ہم سب کو جگایا ہے۔''(۲۵)

مولانا نے خود ایک جگہ ''الہلال'' کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''..... یہ امر واقعہ ہے کہ الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ الہلال نے مسلمانوں کو مقدار کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی' اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی..... میں بتلانا چاہتا ہوں کہ ''الہلال'' تمام تر ''آزادی یا موت'' کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک بحث ونظر کی بنیاد ڈالی' اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے' صرف اس قدر اشارہ کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے' الہلال اس کام سے ۱۹۴۱ء میں فارغ ہو چکا تھا۔''(۲۶)

اگر حق وصداقت کے لیے جدّوجہد کی جائے تو قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندان کی سلاخوں کو سینے سے لگاتے اور ہتھکڑیوں کو چومتے ہوئے حق گوئی اور جہد پیہم سے کنارہ کش نہیں ہوتے۔ ہر حق گو مجاہد کی طرح مولانا کو بھی اس سنتِ یوسفی کو ادا کرنا پڑا۔

۲۸/ مارچ ۱۹۱۶ء کو حکومت بنگال نے ترکوں کی طرف داری کے جرم میں ڈیفنس ایکٹ دفعہ ۳ کے تحت حکم نامہ دے دیا کہ مولانا چار دن کے اندر اندر حدودِ بنگال سے باہر نکل جائیں۔ چنانچہ مولانا رانچی چلے گئے' جہاں پانچ ماہ بعد نظر بند کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں دو مرتبہ رانچی اور تین مرتبہ کلکتہ میں ان کے مکانوں کی تلاشی ہوئی' جن میں کئی قیمتی مسودات ضائع ہوئے۔ مولانا کی کتاب ''تذکرہ'' انہی ایام کی یادگار ہے۔

جنوری ۱۹۲۰ء میں آپ کو رہا کر دیا گیا۔ انہی دنوں ملک میں تحفظِ خلافت اور بعد ازاں ترکِ موالات کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ مولانا نے ان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اسی زمانے میں عوام کے اصرار پر بیعت امامت شروع کی' جس میں تحریک کے سرگرم رہنما حضرت شیخ الہندؒ نے سب سے پہلے مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی اور یوں انہیں ابوالکلام آزاد سے ''امام الہندؒ'' بنا دیا۔ اس دعوت کی پانچ شرائط تھیں:

(۱) نیک کاموں کا حکم' برائی سے روکنا اور توصیۂ صبر۔

(۲) محبت اور نفرت دونوں اللہ کے لیے۔

(۳) سچائی کی راہ میں ہر شے سے بے پروائی۔

(۴) اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ محبوب رکھنا۔

(۵) اچھے کاموں کی اطاعت۔(۲۷)

اس تحریک کے نتیجے میں ۱۰/ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کو گرفتار کر لیا گیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا' جس کے نتیجے

میں ایک سال قید کی سزا سنائی گئی۔ اسی مقدمے میں عدالت کے سامنے اپنا وہ شہرۂ آفاق بیان پیش کیا جو ''قولِ فیصل'' کے نام سے مشہور ہے۔ ۶؍جنوری ۱۹۲۳ء کو رہائی نصیب ہوئی۔

۲۱؍اگست ۱۹۳۰ء کو سائمن کمیشن کی مخالفت پر دوبارہ گرفتار کر لیے گئے۔ ۱۱؍مئی ۱۹۳۲ء کو رہائی نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں ''ترجمان القرآن'' کی پہلی جلد منصۂ شہود پر آئی۔ نیز مولانا کانگریس کے صدر بھی اسی سال بنائے گئے۔ ۳؍جنوری ۱۹۴۱ء کو مولانا کو کانگرس کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد سے گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سال کی زندانی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد ۳؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو رہا ہوئے۔

۹؍اگست ۱۹۴۲ء کو ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تجویز کی منظوری کے بعد دوبارہ گرفتار کر کے قلعہ احمد نگر میں نظر بند کر دیے گئے۔ اسی زمانے میں مولانا کی اہلیہ نے وفات پائی جن کے جنازے میں شرکت کی اجازت تک حکومت برطانیہ نے نہ دی اور یوں مولانا اپنی رفیقہ حیات کا آخری دیدار تک نہ کر سکے۔ اسی دوران مولانا کی دو بہنوں کا انتقال ہوا۔ ''غبارِ خاطر'' کے خطوط جو مولانا نے اپنے دوست مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام لکھے مگر روانہ نہ کیے جا سکے، وہ بھی مولانا نے انہی ایام میں تحریر فرمائے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں احمد نگر سے بانکوڑا جیل منتقل کر دیا گیا اور یہیں سے ۱۵؍جون ۱۹۴۵ء کو رہائی پائی۔ یوں گرفتاری کی کُل مدّت تقریباً ۱۰ سال اور ۷ مہینے بنتی ہے۔ یعنی زندگی کا ساتواں حصہ قید و حراست میں گزرا۔ مولانا خود ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں:

> ''عمر کے ترپن برس جو گزر چکے ہیں، ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے۔ گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گزرا۔ تورات کے احکامِ عشرہ (۲۸) میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا، یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا۔''(۲۹)

مولانا نے ان ایام میں جس ثابت قدمی اور شجاعت کا مظاہرہ کیا وہ اپنی جگہ قابلِ تحسین ہے۔ بہت سے رہنماؤں کو قید و بند کی زندگی کا شکوہ کرتے سنا گیا ہے، مگر مولانا ان ایام کو اپنی متاعِ حیات سمجھتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں کہ ''وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے۔ اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے۔''(۳۰)

قید و بند کی اس زندگی میں اگر مولانا کے معمولات کا جائزہ لیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ لوگ ان حالات میں اپنی اداسی اور تنہائی ختم کرنے کے لیے انجمن تلاش کرتے ہیں، لیکن مولانا تنہائی ہی کو اپنی انجمن اور راحت و سکون کا سامان سمجھتے ہیں۔ ''غبارِ خاطر'' میں لکھتے ہیں: ''میں جب کبھی قید خانے میں سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا دی گئی ہے تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کی لیے سزا کیسے ہو سکتی ہے؟ اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جا سکیں۔''(۳۱)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں: ''زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ، وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔''(۳۲)

مولانا کے نزدیک اصل زندگی جسم کی آسائش نہیں' بلکہ وہ اصل زندگی دل و دماغ کی زندگی کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ''کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔''(۳۳)

اگر مولانا کی اس رائے کو اپنا لیا جائے تو خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں' کیسی ہی مصیبتیں اور غموں کی بارش کیوں نہ ہو رہی ہو' انسان کے لیے کسی غم و تکلیف کی کوئی حیثیت باقی نہ رہے۔ مولانا کی اس طویل زندانی زندگی کے پیچھے بھی ان کا یہی فلسفہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کا عملی مظاہرہ ان کی زندگی کے ایام قید و بند میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے اور اس کی توثیق ان کے اس قول سے بھی ہوتی ہے کہ ''میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی حالت ہو' کوئی جگہ ہو' اس کی تڑپ دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اجڑا' اور ساری دنیا اجڑ گئی۔''(۳۴)

دورانِ اسیری مولانا کے روزمرہ معمولات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وقت کے پابند وہ ہمیشہ سے تھے اور وقت کے ضیاع کو زندگی کا ضیاع تصور کرتے تھے' لیکن ان ایام میں بھی وہ بدستور اپنی اس عادت پر قائم رہے۔ بقول شورش کاشمیری ''وہ چھوٹے سے چھوٹے معمول کو بھی کسی بڑی سے بڑی مداخلت پر قربان کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔ ان کا معمول تھا کہ رات کو جلد ہی سو جاتے۔(۳۵) صبح مولانا بہت جلد اٹھنے کے عادی تھے' منہ اندھیرے ان کی چائے نوشی کے تذکرے سے ''غبارِ خاطر'' بھری پڑی ہے۔

مولانا کے ساتھ جو لوگ قید و بند میں شریک رہے' انہوں نے اپنی اسارتی رفاقت کا تذکرہ مختلف مضامین میں کیا ہے۔ مولانا اسداللہ خان میرٹھیؒ جو میرٹھ جیل میں مولانا کے ہمراہ تھے' اپنا مشاہدہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ ''مولانا کی شخصیت سے جیل خانے میں استبداد پر خوف طاری رہتا اور کوئی سپرنٹنڈنٹ کسی سلسلے میں کبھی چوں چرا نہ کر سکتا تھا''۔ ڈاکٹر سید محمود کے بقول پس دیوارِ زنداں وہ اُسوۂ یوسفی کا صحیح نمونہ تھے۔ حافظ علی بہادر خان جو دورانِ اسیری مولانا کے ساتھ رہے' لکھتے ہیں کہ ''مولانا خبریں منگوانے اور خبریں بھجوانے میں جیل خانے کے ضابطوں سے بے نیاز تھے۔ بقول شورش چونکہ ہر لحاظ سے تنہا تھے اس لیے اندر بھی کوشش کر کے تنہا ہی رہتے۔ غرض مولانا ہندوستان میں ان علمائے حق کا مثالی وجود تھے جو مختلف ادوار میں عصری استبداد سے پنجہ آزماتے رہے اور جن کی عزیمت کا تذکرہ مسلمانوں کی اجتماعی تاریخ کا روشن باب ہے۔''(۳۶)

مولانا کی ادبی خدمات

درحقیقت مولانا ابوالکلام آزادؒ سیاست کے آدمی نہ تھے بلکہ اس پرخار وادی میں وہ اتفاقاً آ نکلے تھے۔ اس کا اظہار بارہا مولانا نے خود بھی کیا ہے۔ مولانا کی علمیت اور ذہنیت کی اصل جولانگاہ علم و ادب تھا اور اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ برصغیر پاک و ہند میں اپنی نوعیت کے منفرد اور یگانہ ادیب و انشا پرداز تھے۔ اگر قوم و ملّت کا درد و غم اور وطن کی آزادی کا عزم انہیں ہندوستان کے سیاسی دھارے میں نہ لے آتا تو وہ آج ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب ہوتے۔ اپنی طبیعت کی اس افتاد کا تذکرہ مولانا نے خود ایک جگہ کیا ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا' سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈ نکالا''۔(۳۷)

اس کے باوجود اردو ادب پر مولانا کے جو احسانات ہیں انہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ قلیل الفرصتی اور انتہائی مصروفیت کے باوجود جو کچھ انہوں نے لکھ ڈالا ہے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے۔

مولانا کی ادبی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۶ء تک کا ہے' جب وہ اخباروں اور رسالوں میں لکھتے رہے۔ اس عرصہ میں انہوں نے بڑے بڑے ادیبوں اور انشا پردازوں کی موجودگی میں اپنے قلم کا سکّہ جمالیا (تذکرہ اسی دور کی یادگار ہے۔) اس دور کی تحریروں میں شدتِ احساس' شدتِ اظہار' لامتناہی تخیل اور بے ضبط مبالغہ سمیت رومانی اسلوبِ تحریر کے وہ تمام اجزاء بدرجہ اَتم پائے جاتے ہیں جنہیں ناقدین ادب اس عالی صنف کی معراج قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ان کا قلم صرف یہیں تک محدود رہا' بلکہ اس کے ساتھ ساتھ الہلال والبلاغ کی تحریروں میں اس کی متضاد اخلاقی شدت اور انتہائی خود اعتمادی' جو بسا اوقات خود پسندی تک پہنچ جاتی ہے' کی واضح چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس تضاد کی تاویل یہی کی جاسکتی ہے کہ الہلال والبلاغ کے مضامین اور ''تذکرہ'' کے عجوبانہ اسلوب کو رومانوی یا خطیبانہ اندازِ تحریر کی بجائے اگر زعیمانہ کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا۔ ''تذکرہ'' کی مذکورہ عبارت کو پڑھئے جس سے ہمارے قول کی تائید ہوتی ہے:

> ''وہی دنیا جس کے میکدۂ خود فراموشی نے غفلت کے جام لنڈھائے تھے' اپنے ہر جلوہ سے آنکھوں کو' اپنے ہر نغمہ سے کانوں کو سرمستی و سرشاری کی پیہم دعوتیں دی تھیں' اب اس کا کونہ کونہ' چپہ چپہ' ہشیاری و بینش کا مرقع تھا' بصیرت و معرفت کا درس تھا۔ ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا' پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا۔ پھولوں نے زبان کھولی' پتھروں نے اٹھ اٹھ کر اشارے کیے۔ خاکِ پامال نے اڑ اڑ کر گہر افشانیاں کیں۔ آسمانوں کو بارہا اترنا پڑا' تاکہ سوالوں کا جواب دیں۔ زمین کو کتنی ہی مرتبہ اچھالنا پڑا' تاکہ فضائے آسمانی کے تارے توڑ لائیں۔ فرشتوں نے بازو تھامے کہ کہیں لغزش نہ ہو جائے۔ سورج چراغ لے کر آیا کہ کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے۔''(۳۸)

اس کے ساتھ ساتھ ''الہلال'' میں مولانا کا جو طرزِ خطاب ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:

> ''اے عزیزانِ ملّت! میں کیونکر تمہیں اپنے دل کے خونچکاں ٹکڑے دکھلاؤں' جس کے ہر ٹکڑے پر زخموں اور ناسوروں کے ہزاروں نشان ہیں۔ اور پھر میں کیونکر اپنا دل تمہارے پہلو میں رکھوں کہ تم اس صدائے الٰہی کو نہیں سنتے' پر میں سنتا ہوں اور کانٹوں پر لوٹتا اور آگ کے شعلوں میں تڑپتا ہوں۔ تم میری آواز سن سکتے ہو' پر اس سوزش و اضطراب کے آتش کدے کو تو نہیں دیکھ سکتے' جو میرے اندر سلگ رہا ہے' اور جس کے شعلے اب اس قدر بھڑک اٹھے ہیں کہ میں ان کے دھوئیں کو نہیں دبا سکتا۔''(۳۹)

ان دونوں طرزِ خطبات میں ایک چیز قدرے مشترک ہے اور وہ ہے مولانا کا زورِ قلم۔ جہاں تک معنی و مفہوم کا تعلق ہے تو ان دونوں میں کوئی مماثلت نہیں۔ اس دور میں مولانا پر عربیت اور فارسی کا بڑا غلبہ رہا اور ان ہر دو

زبانوں کے ملاپ کے نتیجے میں جو ادب تخلیق ہوا اسے مولانا آزاد کے اصطلاحی ادب کا نام دیا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس کی مثالوں سے مولانا کی کتاب ''تذکرہ'' بھری پڑی ہے۔ عملی مشاہدہ کے لیے ذیل کی ان سطور پر غور فرمائیں:

''یہی تخریج در تخریج، وتفریع در تفریع، وقیاس در قیاس واستنباطاتِ رائیہ چند در چند، واقناع بر مجرد قواعد منطقیہ جزئیات وکلیات وتمثیل وتقسیم، وابعد بُعد و اهجر هجر اصلین اساسین کتاب وسنت کی مصیبتِ عظمیٰ ورزیت کبریٰ ہے، جس کی وجہ سے قرناً بعد قرنٍ ونسلاً بعد نسلٍ سخت وشدید غلطیاں بلکہ گمراہیاں واقع ہوتی رہیں اور کارخانۂ شرع میں فسادِ عظیم رونما ہوا۔''(۴۰)

اس طرح کی ثقیل ومبہم عبارات ''تذکرہ'' میں جا بجا دیکھی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہ طرزِ بیان نہ اس سے پہلے کسی کا تھا اور نہ بعد میں اس کا کوئی جانشین ہوا۔ مولانا اس مخصوص طرزِ تحریر کے خاتم تھے۔ بہرحال یہ دور مولانا کے قلم کے شباب کا دور تھا اور اس دور کی تحریروں میں اخلاقی اور تخلیقی ادب کے جو نقوش انہوں نے چھوڑے ہیں وہ انہیں معاصرین سے ممتاز کرتے ہیں۔

مولانا کی ادبی زندگی کا دوسرا دور ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۶ء تک کا ہے جس میں وہ زیادہ تر قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کے کام میں مصروف رہے۔ اس دور میں باوجود سیاسی جھمیلوں کے ان کا دماغ زیادہ تر قرآنی علوم و معارف میں ڈوبا رہا (ترجمان القرآن اسی دور کی یادگار ہے)۔ اس کا اثر ان کے ادبی طرز پر یہ پڑا کہ شدتِ احساس کا رخ خود بینی سے خدا بینی کی طرف مڑ گیا اور زورِ بیاں خود نمائی کی جگہ حق نمائی میں صرف ہونے لگا۔ چنانچہ اب لکھنے والے کے مخاطب لوگوں کے جذبات نہیں بلکہ ان کے ضمیر تھے اور اس مقصد سے پیچھے جو محرکات کارفرما تھے وہ اپنی عزت وعظمت کو بڑھاوا دینا نہیں بلکہ لوگوں کی مذہبی اور اخلاقی روح کا جگانا تھا۔ ''ترجمان القرآن'' کی مندرجہ ذیل سطور پڑھیے جس سے ان کے اس دور کے ادبی رجحان کا پتا چلتا ہے:

''.....فطرت صرف بناتی اور سنوارتی ہی نہیں، بلکہ اس طرح بناتی سنوارتی ہے کہ اس کے ہر بناؤ میں حسن وزیبائی کا جلوہ اور اس کے ہر ظہور میں نظر افروزی کی نمو پیدا ہوگئی ہے۔ کائناتِ ہستی کو اس کی مجموعی حیثیت میں دیکھو یا اس کے ایک ایک گوشۂ خلقت پر نظر ڈالو، اس کا کوئی رخ نہیں جس پر حسن ورعنائی نے ایک نقابِ زیبائش نہ ڈال دی ہو۔ ستاروں کا نظام اور ان کی سیر وگردش، سورج کی روشنی اور اس کی بو قلمونی، چاند کی گرد اور اس کا اتار چڑھاؤ، فضائے آسمانی کی وسعت اور اس کی نیرنگیاں، بارش کا سماں اور اس کے تغیرات، سمندر کا منظر اور دریاؤں کی روانی، پہاڑوں کی بلندیاں اور وادیوں کا نشیب.....غرضیکہ تمام تماشا گاہِ ہستی حسن کی نمائش اور نظر افروزی کی جلوہ گاہ ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس پردۂ ہستی کے پیچھے حسن افروزی وجلوہ آرائی کی کوئی قوت کام کر رہی ہے، جو چاہتی ہے کہ جو کچھ بھی ظہور میں آئے، حسن وزیبائش کے ساتھ ظہور میں آئے، اور کارخانۂ ہستی کا ہر گوشہ نگاہ کے لیے نشاط، سامعہ کے لیے سرور اور روح کے لیے بہشت راحت وسکون بن جائے۔''(۴۱)

تیسرا دور ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۵ء تک کا ہے۔ اس دور میں مختلف عوامل نے مولانا کی طبیعت اور ان کے ادبی اسلوب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ عمر، تجربہ اور قومی ذمہ داریوں کے بوجھ نے ان کے مزاج میں کافی اعتدال پیدا کر دیا۔ نیز بیس سال مسلسل قرآن مجید کے فہم وتفہیم میں مصروف رہنے سے ان کے مذہبی جذبات و

احساسات پر سلوک کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اس دور میں مولانا کی زیادہ توجہ مغربی ادب کی طرف رہی اور اس مطالعہ کے نتیجے میں ان کی تحریر میں اعتدال کی وہ شان پیدا ہوگئی جو مغربی ادب میں انشا پرداز کا منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں کہ ''غبارِ خاطر'' کے اسلوب میں جوان کے اس زمانے کی طرز بیان کی پوری نمائندگی کرتا ہے' دریائے فصاحت کی روانی تو بدستور قائم ہے' لیکن رو سے دریا کی تیزی اور تندی کی جگہ قعر دریا کے جزم وسکون نے لے لی ہے۔ اب صحتِ فکر' ہمواری اور توازن نے مولانا کی تحریر میں اس ادیبانہ اسلوب کی شان پیدا کر دی ہے جو جدید مغربی ادب میں بہترین انشا پردازوں کا طرۂ امتیاز ہے''(۴۲) ذرا غبار خاطر کی ان سطور کا مطالعہ کیجئے:

''جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو' جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو' جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں' کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں' جہاں دوپہر ہر روز چمکے' شفق ہر روز نکھرے' پرند ہر صبح وشام چہکیں' اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش ومسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے؟''(۴۳)

اس ادیبانہ اسلوب میں علمی طرزِ بیان کی تمام بنیادی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں' پوری عبارت میں صحتِ فکر اور الفاظ ومعانی کا ایسا خوبصورت توازن پایا جاتا ہے کہ تمام عبارت سے اگر ایک لفظ بھی ہٹا دیا جائے تو مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ مولانا کے اسلوبِ تحریر میں قرآن کے لب ولہجہ کی واضح چھاپ محسوس کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اس حوالہ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ مولانا نے لکھنے کا انداز' لب ولہجہ اور مواد کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے شخص اور آخری شخص ہیں جنہوں نے براہِ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی اندازِ بیاں اور زورِ کلام اور وعید وتہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں کو رعشہ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ ذرا ان سطور پر غور فرمائیں:

''میں وہ صور کہاں سے لاؤں' جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ میں قوت کیسے پیدا کروں' جن کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت آور ہوشیار ہو جائیں؟ آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل' جن کو زوالِ ملت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر' جو آتش غیرت وحمیت کی سوزش کے لذّت آشنا ہیں''(۴۴)

مولانا ماہر القادریؒ نے انسان کی قلبی کیفیات کو دو اجزاء میں تقسیم کیا ہے' قنوطیت اور رجائیت۔ ان کے نزدیک کل دنیا کے مختلف النوع ومتباین الجنس انسان ان دو کیفیات میں مبتلا ہیں۔ چنانچہ بعض انشا پردازوں نے قنوطیت اور بعض نے رجائیت کو اپنا موضوع قرار دیا ہے۔ اگرچہ قنوطیت ویاس انگیز مضامین اسباقِ عبرت ہوتے ہیں مگر اعلیٰ خیالات' مستحکم عزائم اور بلند حوصلگی میں ان سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ بلکہ اس کے برعکس دل اضطراب اور حزن وملال کی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ مولانا کی طبیعت رجائیت کی طرف زیادہ مائل ہے اور وہ یاس انگیز مضامین کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ غمگین موضوعات پر قلم ہی نہیں

اٹھاتے۔ مشہدا کبر اور ترکوں کی حریت و استقلال اور شہادتوں پر ان کے قلم نے خون کے آنسو برسائے ہیں۔ لیکن ان مضامین کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ غمگین سے غمگین تر مضمون لکھتے وقت بھی امید و رجا کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی حادثہ یا مشکل کی منظر کشی سے زیادہ اس کے مناسب اور دیرپا حل کی طرف توجہ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگِ طرابلس میں مسلمانوں کی خون ریزی پر بجائے اشک و ندامت کے آنسو بہانے کے مولانا اس خون ریزی اور سفا کی کو مسلمانوں کی حیاتِ نو بتلاتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''جنگ طرابلس ایک خون ریزی تھی' لیکن غور کیجئے تو اسی خون ریزی نے اسلام کے نئے دورِ حیات کی بنیاد رکھ دی ہے۔ دنیا میں اصلی طاقت اخلاقی طاقت ہے اور اصل فتح' اخلاقی فتح ہے۔ اس جنگ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے مردہ جذبات میں روح پھونک دی' اور ایک اصلی اور اخلاقی حرکت تمام عالم اسلامی میں پیدا کر دی۔'' (۴۵)

رجائیت کا یہ طبعی میلان مولانا کی تمام ادیبانہ زندگی پر حاوی ہے اور اس کی شہادت ''الہلال'' کے وہ مضامین ہیں جنہوں نے ہندوستان کے تاریک دور میں بالخصوص مسلمانوں اور بالعموم دیگر اقوام کے لیے روشن چراغ کا کردار ادا کیا۔

مولانا کی نثر کی ایک اور بڑی خوبی الفاظ و معانی کی درست نشست و برخاست اور پُر جمال الفاظ کے چناؤ کے ساتھ ساتھ برمحل قوی دلائل سے قاری کو اپنی بات قائل کر لینا ہے۔ واقعہ نگاری اور منظر کشی میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔ ان کی تحریریں جوش و جذبات سے معمور ہوتی ہیں۔ بقول مولانا ماہر القادریؒ کے ان کا لفظ لفظ جوش و اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور ساتھ ہی واقعات کی تصویر بھی نگاہوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ جہاد کا ذکر کریں گے تو محسوس ہوگا کہ مجاہدین کی تلواریں واقعی بے نیام ہیں' ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے زمین کی طنابیں لرز رہی ہیں۔ تکبیر کے نعروں سے رزم گاہ میں گونج پیدا ہوگئی ہے۔ باطل کا پرچم سرنگوں ہو رہا ہے اور حق کی فتح ہو رہی ہے..... ان کا اندازِ تحریر دلوں کو ہلا دینے اور کپکپا دینے والا ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو جوش سے معمور کر دیں اور دنیا کا ہر تغافل آمیز سکونِ حرکت آمیز سکونِ حرکت سے مبدل ہو جائے۔ (۴۶)

مولانا کے ادبی مقام کا ان کے معاصر انشا پردازوں نے بھی اعتراف کیا ہے۔

(۱) اردو کے مشہور انشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی نے مولانا کی نثر کے بارے میں لکھا ہے: ''قادر الکلام کا لفظ ہمارے ہاں شاعروں ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ نثر نگاروں میں کسی پر اس کا اطلاق اگر پوری طرح ہو سکتا ہے تو وہ ابوالکلام کی ذات ہے۔'' (۴۷)

(۲) ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان الفاظ میں ان کے اسلوب کو خراج تحسین پیش کیا ہے: ''ابوالکلام کو خدا نے عظیم شخصیت عطا کی ہے' مگر جس جوہر خاص نے ان کی شخصیت کو عظیم تر بنایا ہے' وہ ان کا عظیم اسلوب ہے جس میں ان کا عزم آہنی' ان کا علمی تبحر' ان کا تجدد (Modernism) ان کی دلکش جمالیت' ان کی داعیانہ خطابت' تحیر خیزی اور ہیبت انگیزی بطور عناصر ترکیبی کارفرما ہو کر ان کے طرزِ بیان کو وہ ارفع مقام بخشتی

ہے جو قدیم عرب کے شعلہ نفس خطیبوں اور قدیم یونان و روما کے ''آزر فشاں'' انشا پردازوں کو حاصل تھا''(۴۸)

(۳) آل احمد سرور مولانا کی نثر کو اردو ادب میں اجتہاد کے نام سے موسوم کرتے ہیں' چنانچہ لکھتے ہیں:
''جدید اردو نثر عربی اور فارسی سے جو کچھ لے سکتی تھی وہ ابوالکلام نے لے لیا۔ عرب کے سوزِ دروں اور عجم کے حسنِ طبیعت' دونوں کو اردو میں سمو لینا اور اردو کو عربی اور فارسی کا غلام نہ ہونے دینا معمولی کام نہیں''(۴۹)

(۴) سجاد انصاری نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ: ''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا' یا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم''(۵۰)

یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی ادبی خدمات کو اردو ادب میں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ادبی شہ پاروں کو اردو ادب میں سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس باب میں وہ اپنے فن کے مجتہد تھے اور ان کا یہ فن انہی سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گیا۔ یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ایک ہی وقت میں دو عبقری شخصیات ہوئی ہیں' ابوالکلام اور اقبال' اور ان دونوں کے ڈھب پر اگر آج بھی کوئی لکھاری لکھنا چاہے تو فوراً پکڑا جائے گا۔ گویا ان کا اندازِ تحریر کاپی (copy) نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور چیز جو ان دونوں میں مشترک ہے وہ ہے بامقصد نثر نگاری اور بامقصد شاعری۔ چنانچہ مولانا کی نثر میں اور اقبال کی شاعری میں مقصدیت کو جو مقام حاصل ہے وہ اور کسی نثر نگار یا شاعر کے ہاں نہیں ملتا۔ اگرچہ سرسید احمد خان اور اس قبیل کے دیگر افراد کے ہاں بھی یہ بامقصد ادب ملتا ہے مگر یہ مقصدیت محض اصلاحِ معاشرہ تک محدود تھی اور مسلمانوں کے زوال کی دیگر وجوہات پر اس کی نظر نہیں تھی۔ جبکہ آزاد اور اقبال کے ہاں جو مقصدیت ملتی ہے اس میں قوم و ملت کے زوال کے تمام اسباب و عوامل پر بحث کی گئی ہے اور اس لحاظ سے یہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ پر بھی ایک ایسا عظیم احسان ہے جس کا بدلہ نہیں چکایا جا سکتا۔ بطورِ مثال مولانا کے چند ادبی و نثری نمونے پیش کیے جاتے ہیں' جن سے ان کے ادبی مقام اور خدمات کا پتا چلتا ہے:

(۱) کارسازِ قدرت کی بھی یہ کرشمہ سازیاں ہیں! کچھ خاک امید کی لی اور کچھ خاکستر حسرت کی۔ دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا اور انسان نام رکھ کر اس ہنگامہ زارِ ارضی میں بھیج دیا۔ کبھی امید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہے' کبھی ناامیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے..... پس اے ساکنانِ غفلت آباد ہستی! وائے راہروانِ سفر مدہوشی و فراموشی!! مجھے بتلاؤ کہ تمہاری ہستی کی حقیقت اگر یہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟..... نہیں معلوم آغازِ عالم سے آج تک یہ سوال کتنے دلوں کے اضطراب و التہاب کا باعث ہوا ہوگا؟ مگر سچ یہ ہے کہ اپنے کان ہی بہرے ہیں' ورنہ کائناتِ عالم کا ذرہ ذرہ اس سوال کا جواب نفی میں دے رہا ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز سے
ہاں ورنہ جو حجاب ہے' پردہ ہے ساز کا(۵۱)

(۲) آہ! کاش مجھے وہ صورِ قیام قیامت ملتا' جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا' اس کی ایک صدائے رعد آسائے شکن سے سرگشتگانِ خوابِ ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا' اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اٹھو! کیونکہ بہت سو چکے' اور بیدار ہو! کیونکہ اب تمہارا خدا تمہیں بیدار کرنا چاہتا ہے۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیا کو دیکھتے ہو پر اس کی نہیں سنتے جو تمہیں موت کی جگہ حیات' زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے!(۵۲)

(۳) میں وہ صور کہاں سے لاؤں' جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جن کی سینہ کوبی کے شور سے سرگشتگانِ خوابِ موت آور ہشیار ہو جائیں؟ کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو دردِ ملت میں خونباری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل' جن کو زوالِ ملت کے زخموں پر ناز ہے؟ کہاں ہیں وہ جگر' جو آتشِ غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟(۵۳)

(۴) اس بارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلالِ صافی کا کوئی جام نہیں بھرا گیا جو دردِ کدورت اپنی تہہ میں نہ رکھتا ہو۔ بادۂ کامیابی کے تعاقب میں ہمیشہ خمارِ ناکامی لگا رہا اور خندۂ بہار کے پیچھے گریۂ خزاں کا شیون برپا رہا۔(۵۴)

(۵) جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول چُن رہے تھے' تو ہمارے حصے میں تمناؤں اور حسرتوں کے کانٹے آئے۔ انہوں نے پھول چن لیے اور کانٹے چھوڑ دیے۔ ہم نے کانٹے چن لیے اور پھول چھوڑ دیے۔(۵۵)

(۶) تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے' لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے' تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔(۵۶)

حواشی

(۱) ابوالکلام آزاد: تذکرہ' ص ۳۱۰۔۳۱۱۔۳۱۲

(۲) ابوسلمان شاہجہانپوری: مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ' ص ۷۰

(۳) ابوالکلام آزاد: تذکرہ' ص ۳۱۱-۳۱۲

(۴) حوالہ ایضاً

(۵) ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر' ص ۱۳۹-۱۴۰

(۶) ایضاً: ص ۲۶

(۷) ایضاً: ص ۱۵۸

(۸) ایضاً: ص ۱۵۹-۱۶۰

(۹) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن' ج ۱' ص ۱۹

(۱۰) ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر' ص ۹۳

(۱۱) ایضاً: ص ۱۰۶

(۱۲) ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر' ص ۳۱۰

(۱۳) چٹان: ۳/ مارچ/ ۱۹۵۸ء

(۱۴) ایضاً

(۱۵) مولانا کے اکثر مخلصین نے اپنی کتب میں یہی لکھا ہے۔ لیکن کہیں یہ بھی نظر سے گزرا ہے کہ مولانا کی برسی کے موقع

پر جواہر لال نہرو نے ہمایوں کبیر کی کتاب کی ان سطور کی تصحیح فرمائی تھی کہ مولانا مصر گئے ضرور تھے لیکن ان کا جامعہ ازہر سے فارغ التحصیل ہونا کسی طور درست نہیں۔ واللہ اعلم!

(۱۶) ہماری آزادی: پہلا باب (۱۷) ایضاً

(۱۸) جس زمانے میں یہ الفاظ لکھے گئے تھے اس کے مطابق الہلال کو ۶۱ برس بیت گئے تھے۔

(۱۹) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد، ص ۳۸۹-۳۹۰ (۲۰) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد، ص ۴۵۷

(۲۱) حوالہ ایضاً (۲۲) معارف: اکتوبر ۱۹۳۲ء، ص ۳۱۳

(۲۳) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد، ص ۴۵۸ (۲۴) افضل حق قرشی: ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ، ص ۱۳

(۲۵) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد، ص ۴۵۸ (۲۶) ابوالکلام آزاد: قول فیصل، ص ۶۸-۶۹

(۲۷) یہ منصوبہ پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور اس سے مولانا بہت مایوس ہوئے۔ اس موضوع پر ملاحظہ ہو ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کی کتاب ''جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی''۔

(۲۸) احکام عشرہ تورات کی کتاب استثناء میں آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو (۵:۷-۲۱)

(۲۹) ابوالکلام آزاد: غبارِ خاطر، ص ۸۶-۸۷۔ یہ سطور ۱۱/ اگست ۱۹۴۲ء کو لکھی گئی تھیں۔ اس حساب سے مولانا کی زندگی کا ہر ساتواں دن قید میں گزرا تھا۔ اس کے بعد مولانا دو سال گیارہ مہینے مزید قید رہے اور یوں یہ مدت سات سال آٹھ مہینے سے بڑھ کر دس سال سات مہینے ہوگئی۔

(۳۰) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر، ص ۸۷ (۳۱) ایضاً: ص ۱۴۲

(۳۲) ایضاً: ص ۱۴۵ (۳۳) ایضاً: ص ۱۳۶

(۳۴) ایضاً: ص ۱۲۷ (۳۵) شورش کاشمیری: ابوالکلام آزاد، ص ۸۴

(۳۶) ایضاً: ص ۹۹-۱۰۰ (۳۷) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر، ص ۱۴۳

(۳۸) ابوالکلام آزاد: تذکرہ، ص ۳۲۵ (۳۹) الہلال: شمارہ ۷/ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ

(۴۰) ابوالکلام آزاد: تذکرہ، ص ۹۹-۱۰۰ (۴۱) ابوالکلام آزاد: ترجمان القرآن، ج ۱، ص ۷۰

(۴۲) ابوسلمان شاہجہان پوری: مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، ص ۱۶۳

(۴۳) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر، ص ۱۲۶-۱۲۷ (۴۴) اصغر مغل: ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے، ص ۱۱۸

(۴۵) ابوسلمان شاہجہان پوری: مولانا ابوالکلام آزاد ایک مطالعہ، ص ۱۳۶

(۴۶) ہمایوں: نومبر ۱۹۳۴ء، ص ۸۴۰ (۴۷) نقوش: ستمبر ۱۹۶۵ء، ص ۵۱۶

(۴۸) ادب لطیف: مئی ۱۹۵۴ء، ص ۱۶

(۴۹) افضل حق قرشی: ابوالکلام آزاد ادبی و شخصی مطالعہ، ص ۶۰۵

(۵۰) ایضاً: ص ۱۷ (۵۱) اصغر مغل: ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے

(۵۲) اصغر مغل: ابوالکلام آزاد کے ادبی شہ پارے، ص ۲۹۷

(۵۳) الہلال: جنوری ۱۹۱۳ء (۵۴) عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، ص ۷۶۰-۷۶۱

(۵۵) ابوالکلام آزاد: غبار خاطر، ص ۱۰۱ (۵۶) عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، ص ۷۶۰

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : درسِ قرآن کی تیاری کیسے؟

مصنّف : خلیل الرحمٰن چشتی

ضخامت : ۸۸صفحات قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ : ادارہ منشورات اسلامی بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

معروف عالمِ دین خلیل الرحمٰن چشتی صاحب کئی علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں۔ان کی بیشتر کتب چشم کُشا حقائق پر مبنی ہیں۔ وہ وسیع المطالعہ شخصیت ہیں۔قرآن و حدیث ان کی کتابوں کا مرکز ومحور ہے۔ ''قواعدِ زبانِ قرآن'' اور ''حدیث کی اہمیت اور ضرورت'' ان کی شاہکار کتابیں ہیں' جن کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتابیں علماء' مدرّسین اور واعظین کی ضرورت ہیں۔

زیرتبصرہ کتاب بقامت کہتر وبقیمت بہتر کا نمونہ ہے۔ جو شخص کچھ عربی سیکھ لیتا ہے اور قرآن کی ایک دو تفاسیر اور حدیث کی چند کتابوں کا مطالعہ کر لیتا ہے تو اسے درس قرآن کا شوق ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی اچھی بات ہے۔قرآن کی تعلیمات کی تبلیغ واشاعت بڑا اعلیٰ درجے کا کام ہے' مگر جس طرح ہر کام کے کچھ لوازم ہوتے ہیں اسی طرح مدرّس کے لیے بھی درسِ قرآن کے بنیادی اصولوں سے واقفیت ضروری ہے۔اس کتاب میں مصنف نے چودہ عنوانات کے تحت درسِ قرآن کے انداز وآداب اور مدرس کے لیے ضروری ہدایات درج کی ہیں جن کی رعایت سے درس قرآن میں پختگی اور تاثیر پیدا ہو جائے گی۔ مدرس کی راہنمائی کی گئی ہے کہ کسی مخصوص سورت' کسی مخصوص آیت کے درس کی تیاری کیسے کی جائے اور کسی خاص عنوان پر درس کی تیاری کے لیے معلومات کیسے اکٹھی کی جائیں۔ یہ چھوٹی سی کتاب لائق مطالعہ ہے۔اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی مل سکتا ہے۔

(۲)

نام کتاب : اسلام اور سیاست

مصنف : محمد زین العابدین شاہ راشدی

ضخامت : ۷۰ صفحات قیمت: ۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ : مکتبہ غوثیہ عسکری پارک' پرانی سبزی منڈی' کراچی

پاکستان سیاسی طور پر جس افراتفری کا شکار ہے اس سے متاثر ہو کر یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ یہاں اقتدار کی خاطر ہر حربہ اختیار کرنا جائز خیال کیا جاتا ہے۔ انتخابات سے صرف چہرے بدلتے ہیں اور اقتدار میں وہی لوگ آتے ہیں جن کے پاس بے حساب ناجائز دولت ہوتی ہے۔ کوئی اچھا آدمی الیکشن نہیں جیت سکتا' کیونکہ بااثر لوگ دھن دولت' دھاندلی اور اثر و رسوخ استعمال کر کے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ حکومت حاصل کر کے وہ اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر قسم کی مراعات حاصل کرتے ہیں۔ غیر ملکی دوروں پر کروڑوں اور اربوں روپے ملکی خزانے سے لٹاتے ہیں۔ الیکشن میں صرف ہونے والا خرچہ وہ کرپشن کے ذریعے پورا کر لیتے ہیں۔ جو حکمران بنتا ہے وہ کرسی کو بچانے کی فکر میں لگا رہتا ہے اور اسے عوام کی فلاح و بہبود سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔

مصنف نے بڑی دردمندی سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا مگر یہاں شریعتِ اسلامیہ نافذ نہیں ہو سکی اور آج حال یہ ہے کہ ملکی قوانین' اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔

مصنف نے ووٹ کی شرعی حیثیت کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور سربراہِ مملکت کے انتخاب کا اسلامی طریقہ بھی بتایا ہے۔ احادیث کے حوالہ سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ حکومتی عہدے حاصل کرنے کا امیدوار بننا جائز نہیں ہے۔ قومی اسمبلی قانون ساز ادارہ ہے جو کثرتِ رائے سے قرآن و حدیث کے خلاف قانون سازی کر سکتا ہے' حالانکہ اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ ہونا چاہیے۔ صدر اور گورنر بے پناہ صوابدیدی اختیار رکھتے ہیں۔ وہ قانون کی گرفت سے آزاد ہیں' اس لیے جتنی مرضی کرپشن اور جرائم کریں' حتیٰ کہ وہ عدالت کی طرف سے دی گئی سزا کو یک قلم موقوف بھی کر سکتے ہیں۔

مصنف نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے طرزِ حکومت کا حوالہ دیتے ہوئے نفاذِ شریعت کی برکات کو واضح کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مروجہ الیکشن مسئلے کا حل نہیں بلکہ نظام کی تبدیلی کے لیے انقلاب ناگزیر ہے' جس کے ذریعے سے صالح قیادت آئے جو ملک و قوم کی خیر خواہ اور شریعتِ محمدیؐ کی وفادار ہو۔

(۳)

نام رسالہ : قلم وکتاب (ماہنامہ القاسم کی خصوصی اشاعت)

مدیر مسئول : حافظ محمد قاسم

ضخامت : ۲۱۶ صفحات قیمت: درج نہیں

ملنے کا پتہ : القاسم اکیڈمی جامعہ ابوہریرہ، برانچ پوسٹ آفس خالق آباد، ضلع نوشہرہ

ماہنامہ ''القاسم'' پابندی کے ساتھ محترم مولانا عبدالقیوم حقانی کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔ زیر تبصرہ شمارہ تین شماروں، ستمبر، اکتوبر، نومبر کا متبادل ہے۔ یہ شمارہ ۱۸ مضامین پر مشتمل ہے، جس میں عصرِ حاضر کے معروف علماءِ اسلام کی منتخب تحریریں شامل ہیں۔

ماہنامہ القاسم کا یہ قلم وکتاب نمبر دراصل القاسم اکیڈمی کی تازہ ترین اشاعتوں پر تبصروں کا حاصل ہے، جس میں اکیڈمی کی جدید ترین مطبوعات کا تعارف بھی شامل ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے آسمانِ ولایت کے ایک ستارے مولانا محمد عبداللہ درخواستیؒ کے سوانح حیات ''مردِ قلندر'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کیے ہیں۔ ایک صاحب نے کتاب کے عنوان کو نامناسب اور موہم ضرر قرار دیا تو اس لفظ پر فاضلانہ بحث شروع ہوگئی۔ اس اشاعت میں اکثر وبیشتر مضامین میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قلندر کا لفظ اس درویش منش انسان کے لیے بولا جاتا ہے جو دنیاوی تعلقات چھوڑ کر روحانی ترقی کی جانب گامزن ہو۔ اس لفظ کے لغوی معانی کے اعتبار سے مردِ قلندر پر اعتراض بجا مگر عرفِ عام اور اصطلاحی معنی کے طور پر اس کا استعمال خدا رسیدہ اور پاک باطن افراد کے لیے آتا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی لفظ قلندر کو اچھے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اس شمارے میں لفظ ''قلندر'' کی تحقیق کے عنوان سے مولانا نوراللہ نوروزیرستانی کی تحریر قابلِ داد اور لائقِ مطالعہ ہے۔ ❁❁

مبارک باد

قرآن اکیڈمی کے شعبہ تحقیق اسلامی کے ریسرچ فیلو اور شعبہ تدریس کے استاذ حافظ محمد زبیر صاحب کو پی ایچ ڈی کی تکمیل پر ہم ادارہ کی طرف سے مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ حافظ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں ''عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد: ایک تجزیاتی مطالعہ'' کے عنوان سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ان کے مقالہ کے سپروائزر ڈائریکٹر شیخ زید اسلامک سنٹر، پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد اعجاز صاحب تھے جبکہ زبانی امتحان میں ان کے ممتحن چیئرمین شعبہ علوم اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور ڈاکٹر عبدالرؤف ظفر صاحب تھے۔

- Ibn-e-Rushd (the great Averroes): the philosopher, physician and logician
- Ibn-e-Arabi: the most famous, although controversial, person in the field of philosophy and mysticism; titled as "Al-Shaikh-ul-Akbar" by his disciples and admirers
- Ibn-e-Hazm: The most rational expounder of Tafseer and Hadith having independent and logical opinions in the field of Fiqh

The light that these scholars gave to the humanity at large is still shinning, but after the Muslims and their culture and civilizations were wiped off from the soil of Spain, the fate that befell this country has been described by Lane-Poole in his bitter and lamenting words:

> "The Moors were banished; for a while Christian Spain shone, like a moon with a borrowed light; then came the eclipse, and in that darkness Spain has groveled ever since." [Lane-Poole, *Moors in Spain*, p. 280]

★ ★ ★ ★ ★

strong wall pierced by 20 gates and flanked by 1,030 towers. The castle named Qasba was in the centre of the town and each house of the city had a beautiful garden of its own." On the summit of one of the hills opposite the city, Ibn-ul-Ahmar built the fortress of Al-Hamra, which was capable of holding 40,000 men. Al-Hamra, no doubt, represents the final height of culture and architecture achieved by the Arabs in Spain as some historians call it, "the fabric of the genii". Opposite to the Al-Hamra on the side of a steep mountain stood the celebrated royal villa of Al-Generaliffe (corrupted from the Arabic Jamia al-Arif from an exquisite mosque attached to the villa). It also, to use the words of a clever writer, "was a marvel of beauty with fountains, groves and flowers".

iii. **At a time when the whole of Europe was plunged in darkness and ignorance, Muslim Spain was glittering with peace and prosperity, administration and agriculture, trade and industry, and on top of all of these, knowledge and wisdom. No town, however small, was without college or schools; whilst each principal city possessed a separate university of its own**; those of Cordova, Saville, Granada, Malaga, Saragossa, Lisbon Salamanca among others, occupied the most distinguished positions. **The Arabs at the height of their glory revived the sciences and arts as well as philosophy and wisdom of the ancient Greece, added to them the wisdom and knowledge of the East, invented so many sciences and techniques and then passed all this treasure of knowledge to the people of Europe through the universities of Spain. And it was, without any doubt, under their influence that both of the famous movements of Reformation in religion and Renaissance in knowledge and thought, started in Europe.**

iv. The Muslim scholars of Spain made great strides in medicines, history, geography, mathematics and astronomy in addition to logic, philosophy and various Islamic sciences of Tafseer, Hadith, Fiqh, Kalaam and Mysticism.

a) Among the host of historians, the most prominent are Ibn-e-Hayyan, Ibn-ul-Abbar, Ibn-e-Bushkuwal, Ibn-e-Ubaidullah al-Barki, Ibn-ul-Khatib, and last but not the least, the most renowned sociologist and philosopher of history Ibn-e-Khaldoon.

b) Some of those famous for their work in the field of medicine are Ibn-e-Bajah, Ibn-e-Tufail, Ibn-e-Zuhr, Ibn-e-Wafid, Muhammad Tamimi, Dawood al-Aghrabi, Ibn-ul-Awwam and Ibn-e-Baitar.

c) Those famous for their work in the field of geography are Ibn-e-Hameed, Ibn-e-Jubair and Idreesi of Malaga.

d) Those famous in the fields of mathematics and astronomy are Ishbili, Zarqani, Ibn-e-Abi Salat and Ibn-e-Yousuf.

e) And on top of all of these can be counted the three most famous philosophers and theologians that Muslim Spain produced i.e.

Note: Ta-Ha Publishers Ltd. (1, Wynne Road, London SW9 have recently published a book titled "Blood on the Cross", written by Ahmad Thomson which fully describes "the fate of Islam and Muslims in Spain in the light of Christian persecution through the ages". In addition to that, this book gives a historical survey of the sectarian differences and infighting among the Christians which shows that never on the surface of the earth so much blood was split on the basis or religious differences as in the case of Christianity.

★ ★ ★ ★ ★

As regards the height of civilization and culture reached by Spain under the Arabs, it will suffice to mention a few things

i. It requires a lot of imagination to believe that about 1,000 years back in history, Cordova was a city 24 miles in length, 6 miles in breadth with a population exceeding one million, having 3,800 mosques, 60,000 palaces and big mansions, 200,000 houses inhabited by common people, 700 public baths, 80,000 shops, a large number of hostels and sarais, and innumerable number of libraries. The magnificence of Cordova in the days of this glory can be judged by the statement of an old author to the effect that one could travel for 10 miles "by the light of lamps along an uninterrupted extent of buildings". The beautiful mosque of Cordova which became the ornament of Spain attained the status of the "harem" for Western Islam about which Iqbal, the poet-philosopher of Islam says:

ہے تجھ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں!

"(O Harem of Cordova!) Nothing can match you in beauty except the pure heart of a true Muslim."

Its construction was begun by Abdul Rahman al-Dakhil and completed by his son and successor Hishaam I. But it was the 8th king of the dynasty, Abdul Rahman al-Nasir who added new dimensions to its size, beauty, decoration and grandeur.

Abdul Rahman al-Nasir built the palace Al-Zahra 4 miles to the west of the city, about which many old writers admit that it is impossible to give in words a proper description of "the boldness of the design, the beauty of the proportions, the elegance of the ornament and decoration, whether of carved marble or of molten gold, of the columns that seemed from their symmetry as if cast in moulds, of the paintings that equaled the choicest bowers themselves, the vast but firmly constructed lake and the fountains with the exquisite images".

ii. In the same manner, Granada had a population of 400,000 people in the middle of the 15th century of Christian Era. In the words of a historian, "Granada stood like a watch-tower in a meadow. It was encompassed by

civilizations also grow old and weak with the passage of time just as each human individual passes naturally from youth to old age. But the manner in which a whole nation was exterminated, and a whole civilization washed off is a peculiar phenomenon which displays the deceit and treachery as well as ruthlessness and cruelty of the outwardly religious personalities of King Ferdinand and Queen Isabella and their descendents.

The last king of Granada Muhammad Abu Abdullah, who had himself revolted against his father Ali Abul Hasan and later played as a tool in the hands of Ferdinand and Isabella, had surrendered the town on the terms that he would get an estate in Al-Basharat (Spanish: Al-Pujarras) and all Muslims would be secure in person and property, observing their own laws and absolutely free in the practice of their religion. But, in the words of Professor Hitti:

> "Their Catholic Majesties Ferdinand and Isabella failed to abide by the terms of capitulation. Under the leadership of the Queen's Confessor Cardinal Ximenez de Cisneros, a campaign of forced conversion was inaugurated in 1499. The Cardinal at first tried to withdraw from Circulation Arabic books dealing with Islam by burning them. Granada was the scene of a bonfire of Arabic manuscripts. The Inquisition was then instituted and kept busy. All Muslims were now reminded that their ancestors had been Christians and that they either submit to baptism or suffer the consequences. As a result, many became crypto-Muslims professing Christianity but secretly practicing Islam. Some would come home from their Christian weddings to be married secretly after the Muslim rite, many would adopt a Christian name for public and an Arabic one for private use. As early as 1501, a royal decree was issued that all Muslims in Castile and Leon should either recant or leave Spain. In 1526, the Muslims of Aragon were confronted with the same alternatives. In 1556, Philip II promulgated a law requiring the remaining Muslims to abandon at once their language, worship, institutions and manner of life. The final order of expulsion was signed by Philip III in 1609, resulting in the forcible deportation *en-masse* of practically all Muslims on Spanish soil. Between the fall of Granada and the first decade of the 17th century, it is estimated that about 3 million Muslims were banished or executed."

I have given this long quotation to show those of you who belong to the Indian subcontinent the picture of the coming events in South Asia if, as I said in the beginning, the direction of the events did not change by Allah's special Will and intervention which as a rule comes after requisite human struggle and effort. May Allah give us the courage and determination to rise to the occasion and fulfill our duties as defenders of Islam and the Ummah of Muhammad ﷺ. Amen!

After five years of friendship and the game of hide-and-seek, Abdul Rahman succeeded in entering Spain (that is why he is surnamed "*al-Dakhil*" or "the one who entered") and capturing power with the help of Syrian and Yamani Arabs who were settled in Spain, and the Berbers who were his maternal uncles

This Omayyad period of Spanish history can be further sub-divided into two parts. During the first part, extending from 755 to 929 C.E., although the Omayyad ruled Spain absolutely independently but they did not assume the title of Caliph or Ameer-ul-Momineen. It was in the year 929 that Abdul Rahman The 3rd assumed the title of "*Al-Khalifah al-Nasir li-deen Allah*", that is why he is surnamed "al-Nasir". But after the death of his successor al-Hakam in the year 976, the Omayyad caliphs of Spain were more or less nominal rulers, confined mostly to the palaces. During this period, which ended in 1031, the real authority was in the hands of their chamberlains or the Hajibs who ruled in the name of the caliphs. The first Hajib named al-Mansoor is counted among the greatest generals and military leaders of human history. In 1031, the rule of Hajibs as well as the caliphate of the Omayyads came to a sudden end.

★ ★ ★ ★ ★

The 3rd period of the history of the Muslim Spain, although the longest i.e. from 1031 to 1492 C.E., was actually a period of continuous and steady decline and downfall during which the Muslim Spain was divided in as many as 26 petty states quarrelling and fighting with one another whereby encouraging, rather inviting, the neighbouring Christian rulers to increase their zones of influence by helping one Muslim ruler against the other at one time and reversing the sides on another occasion, with the result that these petty Muslim states started falling one by one into the hands of the Christians. This process reached its zenith by the middle of the 13th century of the Christian Era when the Muslim rule was reduced and confined to Kingdom of Granada only. This last Muslim kingdom of the Iberian Peninsula withstood the Christian onslaught for no less than two centuries, but at last, succumbed to the invasions of King Ferdinand and Queen Isabella and came to a final end with the fall of Granada in the year 1492 C.E.

This process of decline and downfall would have been much faster, and the final end of the history of Muslim Spain would have come much earlier, had there been no fresh injection of the nascent human potential and reinforcement and revival of religious fervor by two Muslim reformist and revivalist Berber movements of North Africa under the titles of Al-Murabitun and Al-Muwahhidun during the 11th and 12th centuries of the Christian Era.

★ ★ ★ ★ ★

As regards the reasons of the downfall of the Arabs in Spain, even Spengler's view of history can be an enough explanation, that is to say that nations and

★ ★ ★ ★ ★

Some historians say that Musa bin Nusair had crossed the Pyrenese Mountains into France while others say he was just planning for it when recalled. But it is agreed that Musa bin Nusair wished to conquer the whole of Europe and shake hands with the caliph at Damascus reaching there via France and Rome. Professor Hitti has mentioned this rather jokingly, but looking at the conditions prevailing in Europe at that time and keeping in view the great momentum of the Arab-Berber wave of conquest, it was definitely possible, had there been no internal strife at the heart of the Arab empire.

★ ★ ★ ★ ★

The history of Muslim Spain is divided into three periods: the first extending from 712 to 755, second from 755 to 1031 and the third from 1031 to 1492 C.E.

During the first period, Spain was a sub-province under the Omayyad governor of West Africa. For the first 33 years, it was actually controlled by the centre, but during the last 10 years, it was nearly autonomous under Ameer Yousaf al-Fahri. During these 43 years, no less than 23 governors or ameers ruled Spain, the longest tenure being that of the above-mentioned Yousaf. Nevertheless, this was the glorious period of conquest and extensions during which Muslim armies comprising of the Arabs and the Berbers crossed the Pyrenese and reached the heart of France, capturing Narbonne in the south of France, and Bordeaux and Poitiers in the south-west, reaching as far as Tours merely 180 miles south of Paris which was the farthest point of the Muslim advance from where they were repulsed in 732 C.E. (exactly 100 years after the death of the Prophet ﷺ). About this battle of Tours, Professor Hitti says, "Gibbon and after him other historians would see in Paris and London mosques where Cathedrals now stand, and would hear the Quran instead of Bible expounded in Oxford and other seats of learning, had the Arabs won the day".

But even after that, Muslim advances continued elsewhere and reached even Lyon, about 300 miles to the south-east of Paris. This means that approximately half of France was trampled under the feet of Muslims. Moreover, it seems that the victory of Islam reached farther than the victory of the Muslims, because Emperor Hoffa, the greatest King of England during the 8th century is said to have embraced Islam and got the words لا الٰہ الا اللہ وحدہ لاشریک لہ engraved on his gold coins preserved to this day.

★ ★ ★ ★ ★

The second period of the history of the Muslim Spain consists of an independent Omayyad Kingdom which lasted for two and three-quarter centuries. This kingdom was established by Abdul Rahman, a lone prince of the house of Omayya and the grandson of Hishaam, the 10th Omayyad caliph, who escaped the massacre after the Abbasid Revolution of the year 750 C.E.

[*Al-Anbiya*: 111] which mean "I don't know whether, what is promised to you has come near or is still at some distance" and "I don't know, there might be some further period of testing and hence a fresh lease of existence for you for some while".

★ ★ ★ ★ ★

There are many similarities between the history of Muslim Spain and that of Muslim India. The most conspicuous and striking of these similarities is that Islam entered the European continent through Spain and the Indian continent through Sindh at exactly the same time in history i.e. the years 91 to 94 of the Hijri calendar, corresponding to the years 710 to 714 of the Christian Era. It was a time when 80 years had passed after the death of the Holy Prophet ﷺ and even the pious Caliphate had come to an end no less than half a century ago, with the result that the grace and the blessings of the days of the Prophet ﷺ and even those of the pious Caliphate never touched the lands of Europe as well as of South Asia, and although the practice of Islam and the religious fervor of Eman, as well as the missionary zeal of *Dawat Ilal Allah* and the spirit of *Jihad fi Sabeel Allah* were still intact in the personal character of many Muslims, the pristine purity of the true Islamic faith and the republican character of the Islamic state had been replaced by the curse of monarchy and the accompanying tribal and regional struggle for power and ascendancy, and at least at the collective and state level the missionary zeal of Islam had largely been replaced by the lust for conquest and hegemony.

★ ★ ★ ★ ★

Waleed bin Abdul Malik bin Marwan was the sixth caliph of the Omayyad dynasty and it was during his reign that in the year 92 A.H. (711 C.E.), Sindh was invaded by Muhammad bin Qasim al-Saqafi under the command and control of the governor of Eastern province, Hajjaj bin Yusuf, so notorious for his tyranny and cruelty. Spain was invaded by Tariq bin Ziad, a Berber by descent and a freed slave of Musa bin Nusair, the governor of North Africa west of Egypt. And, due partly to the local conditions in Sindh as well as Spain, that is the tyranny of the rulers and infighting of the religious sects, especially the persecution of the Jews in Spain and the lower casts in India, and partly to the zeal and fervor of Jihad in the Muslim soldiers, so lightening and astonishing were the victories achieved by both these Generals that nearly whole of the valley of Sindh upto the foot-hills of Kashmir as well as a big chunk of Rajputana and almost whole of the Iberian Peninsula, were occupied by the Muslims in no time. But, alas, due to the palace intrigues and the struggle for power and ascendancy as well as mutual contempt and enmity among the ruling elite in the heart land of the Muslim empire, on the one hand Muhammad bin Qasim was recalled and murdered and on the other hand, firstly Musa bin Nusair reprimanded and punished Tariq bin Ziad and then Musa bin Nusair himself was recalled by Waleed and later humiliated by Sulaiman, his brother and successor.

A BRIEF SURVEY OF
THE HISTORY OF MUSLIM SPAIN
AND IT'S SIMILARITY WITH
THE HISTORY OF MUSLIM INDIA

[Text of the speech delivered by **Dr. Israr Ahmad**, Ameer Tanzeem-e-Islami Pakistan, as Chief Guest Speaker at the 1st International Convention of the Islamic Medical Association of North America, held at Hotel Monica, Nerja, Spain from 22nd to 25th of June, 1990]

Dear brothers and sisters in Islam, and the very dear youth!
السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

It is indeed a great pleasure and honour to be here with you and address so many Muslim physicians and surgeons working mostly in North America and having a religious orientation. But, at the same time, my heart is bleeding with grief and sorrow, and I am sure that hearts of all of you must also be bleeding, because at the moment we are in a country where Muslim power, civilization and culture flourished for no less than eight long centuries. Then they were wiped out in a manner that has no parallel in the known history, with the result that a whole nation was exterminated by either mass killings or forced evacuations and expulsions. And so in this way, the Muslims of Spain --- the Arabs, the Berbers as well as local converts --- met the same fate as befell the people of Nooh, Hood, Swalleh, Loot and Shuaib ﷺ. In the words of the Quran كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا [*Al-A'raf*: 92; *Hood*: 68, 95] and لَا يُرَىٰ إِلَّا مَسَاكِنُهُمْ [*Al-Ahqaf*: 25] meaning "As if they never lived there" and "only the dwellings can be seen, none of the dwellers".

★ ★ ★ ★ ★

Personally for me, there is an additional factor of grief and concern because for the last five years or so I have been observing that the events in the Indian sub-continent i.e. Bharat and Pakistan are moving in a direction which, if not turned by Allah's Special Grace and Mercy, may lead to the same fate for the Muslims of that region. To some it might appear as fantastic and a very far-fetched idea, but to me it appears to be inevitable, unless some dramatic and miraculous change occurs due to some special Divine Will and intervention. The only solace that I can get is from the Ayat at the end of Surah *Al-Anbiya*: وَإِنْ أَدْرِي لَعَلَّهُ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ [*Al-Anbiya*: 109] and وَإِنْ أَدْرِي أَقَرِيبٌ أَم بَعِيدٌ مَّا تُوعَدُونَ

The Jews and the Christians recognized the virtues of the believers and their Prophet (SAW) and knew that they were on the right path but because of their envy and selfishness, they wanted them to be deprived of the blessings of Allah (SWT) and renounce the truth after they had believed.

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۗ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

(101) And how would you disbelieve while revelations of Allah are being recited to you, and among you is His Messenger. And whoever holds firmly to Allah, will indeed be guided to the right path.

i.e. why do you not believe in Allah (SWT) when His Messenger is present amongst you and he recites and conveys to you His *ayaat* and calls you to faith with clear proofs and evidences which confirm the truth. *"And whoever holds firmly to Allah, will indeed be guided to the right path."* i.e. whoever devotes himself to Allah's obedience, trusting and relying on Him, will indeed achieve guidance and the truth. He that holds fast to Allah (SWT) shall be guided to the right path.

From here begins the second half of this *surah*. In this section, instructions have been given to the Muslim *Ummah* about the reformative work they had to perform. They have also been taught how to deal with the People of the Book and the hypocrites. This section also gives a commentary on the Battle of *Uhud*. The first three *ayaat* are very important and describe the methodology according to which each Muslim must perform his duties.

End Notes

[7] Surah At-Taubah (9): 31

[8] Musnad Ahmed 4: 378, Tuhfat-ul-Ahwadhi 8: 492, At-Tabari 14: 210

[9] The Arabic word 'Hanif' denotes a person who denounces all other paths in order to follow one particular course.

[10] Sahih Bukhari 9: 17

[11] The word Gentile has several meanings but in the most common modern use it refers to a non-Jew. In their scriptures they define it as "a pagan or a heathen or someone who is not a Jew or a Christian." Sometimes they also use the term Goy as a disparaging term for one who is not a Jew.

[12] The Talmud is a rabbinic discussion on Jewish law, Jewish ethics, customs, legends and stories, which Jewish tradition considers authoritative. It expands on the earlier writings in the Torah in general and in the Mishnah in particular and much of rabbinic literature. (Wikipedia)

[13] Yebamoth 98a

[14] Sanhedrin 57a

[15] cf. Ibn Kathir.

★ ★ ★

and his son *Ismail* (AS). This is the first mosque that was built for the worship of Allah (SWT) and is full of blessings and guidance for all mankind till the Day of Judgment.

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۗ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٧﴾

(97) In it are manifest signs, the station of Abraham; whoever enters it attains security. Pilgrimage to this house is a duty to Allah for those who can afford the journey, but whoever disbelieves then Allah stands not in need of any of the worlds.

i.e. it has signs that Allah (SWT) has honored and has blessed, like the station of *Ibrahim* (AS) (the spot where *Ibrahim* stood). He has also made this place a secure sanctuary; whosoever enters it remains safe from his enemies and attains peace. Even in the days of ignorance, there was peace and security in the *Ka'bah* and in its surroundings and no one dared to touch his enemy even if he was a murderer of his father. *"Pilgrimage to this house is a duty to Allah for those who can afford the journey, but whoever disbelieves then Allah stands not in need of any of the worlds"* Pilgrimage to the *Ka'bah* has been made obligatory on those believers who can afford the journey to carry out the command of Allah (SWT) till the Day of Resurrection. But whoever denies the necessity of performing the Pilgrimage becomes a disbeliever as is recorded by *Abu Bakr Al Ismaili* that *Umar Bin Al-Khattab* (RAA) said: *"Whoever can afford the Pilgrimage but does not perform it, there is no difference in his case if he dies as a Jew or a Christian."* [15]

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٨﴾

(98) Say: "O people of the Book! Why do you deny the revelations of Allah? Allah Himself is a witness to what you do."

Here the address is to the Jews and the Christians who had the knowledge from their scriptures that Prophet Muhammad (SAW) is the last Messenger and what he is sent with is the truth but still denied it.

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿٩٩﴾

(99) Say: "O people of the Book! Why do you obstruct the believers from the path of Allah (SWT), seeking to make it crooked, while you yourselves are witnesses? And Allah is not unaware of what you do."

Although they knew that Islam is the truth, yet they rejected it and used to plot against those who believed in it so as to create doubts about Islam and to lead them astray from the right path.

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿١٠٠﴾

(100) O you who believe! If you obey those who were given the Book, they would (indeed) render you disbelievers after you have believed.

punishment even if they offer as ransom huge amounts of gold. They shall be sternly punished and none shall help them.

لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ ۚ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿٩٢﴾

(92) By no means shall you attain righteousness unless you spend of that which you love; and whatever of good you spend, Allah knows it well.

This subject has already been dealt with in *ayah* 177 of *surah Al-Baqarah*. This *ayah* states that a person cannot achieve the position of piety and righteousness until he spends in Allah's cause from that which he loves most. And whatever he spends, whether openly or secretly, Allah (SWT) knows it well.

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٩٣﴾

(93) All food was lawful to the children of Israel except what Israel made unlawful for itself before the Torah was revealed. Say: "Bring the Torah and recite it if you are truthful."

Prophet *Ya'qub* (AS) did not eat certain things because he did not like them. But the *Children of Israel* thought that those things were unlawful and they also started to abstain from them. One of the things that *Ya'qub* (AS) made unlawful to himself before the revelation of *Torah* was the meat of camel, therefore, the Jews objected to the Holy Prophet (SAW) for making camel meat lawful when it had been made unlawful in the time of the previous Prophets. But Allah (SWT) commanded the Prophet (SAW) to ask the Jews to provide evidence from their own scripture, the *Torah*, if what they claimed was true.

فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٩٤﴾

(94) Then after this whoever invents a lie against Allah, it is indeed they who are the wrong-doers.

i.e. whosoever forges a lie and distorts the scriptures is indeed a great transgressor.

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٥﴾

(95) Say: "Allah has spoken the truth, so follow the religion of Abraham, the upright, and he was not of the Mushrikeen (idolaters)."

i.e. Allah (SWT) has made known the truth in the *Qur'an* through Prophet Muhammad (SAW) and has ordered to follow *Ibrahim* (AS), who was an upright man and did not associate partners with Allah.

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾

(96) Verily, the first House (of worship) appointed for mankind was that at Bakkah full of blessing and a guidance for all the worlds.

Bakkah and *Makkah* are one and the same and the House referred to in this *ayah* is the *Ka'bah*, a structure built by Prophet *Ibrahim* (AS)

This *ayah* refers to the Jews and the Christians who denied Prophet Muhammad (SAW). They testified to the fact that they were foretold about the coming of Prophet Muhammad (SAW) in their scriptures but they still rejected him after all the proofs were established and truth became clear to them. So Allah (SWT) says: *"But Allah does not guide the wrongdoers"* i.e. those who do not believe in Prophet Muhammad (SAW) and follow his teachings will not be guided in this world nor will they ever attain salvation in the Hereafter.

أُولَٰئِكَ جَزَآؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَٰئِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾

(87) The reward of such people is that upon them is the curse of Allah, the angels and all mankind.

i.e. for those who reject Allah's Messengers, the reward will be the curse of Allah (SWT), the angles, and all men.

خَٰلِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٨٨﴾

(88) They will abide therein; neither will their punishment be lightened nor will they be given respite.

i.e. they will remain under the curse forever and their torment will not be lessened at all and they shall abide there forever.

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِن بَعْدِ ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾

(89) Except for those that repent after that and do righteous deeds. Verily, Allah is Oft-Forgiving, Most Merciful.

If a person sincerely repents and mends his ways, Allah (SWT) opens the doors of forgiveness and mercy for him, for He is Forgiving and Merciful.

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَٰنِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّآلُّونَ ﴿٩٠﴾

(90) Verily, those who disbelieve after their belief and then went on increasing in their disbelief, their repentance will never be accepted. And they are those who are astray.

Allah (SWT) states that He will not accept the repentance of those who revert to disbelief after having believed and then their disbelief kept on increasing till death approached them. They are the ones who have gone astray.

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ بِهِ ۗ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّٰصِرِينَ ﴿٩١﴾

(91) Verily, those who disbelieved and die while they were disbelievers, the earth full of gold will not be accepted from anyone of them if they offered it as a ransom. For them is a painful torment, and they will have no helpers."

i.e. those who die while they are disbelievers, their abode will be Hellfire and they will not be given respite from the dreadful

فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿٨٢﴾

(82) Then whosoever turns back after this, he will become the transgressor.

i.e. whoever turns back from the covenant and rebels and rejects the Messenger (SAW) will surely be regarded as a transgressor.

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿٨٣﴾

(83) Do they seek for other than the Deen of Allah, while all creatures in the heavens and on earth have submitted to Him willingly or unwillingly? And to Him shall they all be brought back.

Islam is the only *Deen* approved by Allah (SWT). All the creatures submit to Him alone. The faithful believers submit to His will consciously but those who do not consciously submit to Him, have to submit to the laws of nature enforced by Him which govern the whole universe, thus submitting to His will by compulsion. *"And to Him shall they all be brought back"* i.e. to Him they shall all return on the Day of Resurrection.

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿٨٤﴾

(84) Say: "We believe in Allah and in what has been revealed to us and what was revealed to Abraham, Ishmael, Isaac, Jacob and his progeny and what was given to Moses, Jesus and the Prophets from their Lord; we make no distinction between one and another among them and to Him we have submitted."

Here as already mentioned in *ayah* 136 of *surah Al-Baqarah*, Allah (SWT) directs the believers to say that they believe in what was revealed to Prophet Muhammad (SAW) i.e. the *Qur'an*, and also the previous Prophets of Allah (SWT) and not to make any distinction between them by following some and rejecting the others and to submit themselves to His will.

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

(85) And whoever seeks a religion other than Islam, it will not be accepted of him and in the Hereafter he will be one of the losers.

i.e. no religion is acceptable with Allah (SWT) except Islam i.e. belief in Allah (SWT) and accepting Prophet Muhammad (SAW) as His last Messenger and following his teachings. Whosoever refuses to do so will be amongst the losers.

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٨٦﴾

(86) How shall Allah guide those who reject faith after they accepted it and bore witness that the Messenger was true and after clear signs came to them. But Allah does not guide the wrongdoers.

Although this *ayah* specifically refers to the Christians but it also refutes the beliefs of those who attribute wrong things to the Prophets, angels or religious scholars and make them objects of worship. This *ayah* states that no Prophet of Allah (SWT) ever advised people to worship him instead of Allah (SWT) as is the belief of the Christians who worship Prophet *'Isa* (AS) as Allah's son. Prophet *'Isa* (AS) never taught them to worship him or consider him as Allah's son. In fact every Prophet sent by Allah (SWT) invited people to worship Allah (SWT) alone and devote themselves to His obedience and this is what Allah (SWT) has revealed in all the Books sent to them for their guidance.

وَلَا يَأْمُرَكُمْ أَن تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُم بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿٨٠﴾

(80) Nor would he order you to take angels and prophets for Lords. Would he enjoin you to disbelieve after you have become believers?

i.e. the Prophets have always called people to worship Allah (SWT) alone and surely not to worship his self or the angels. *"Would he enjoin you to disbelieve after you have become believers"* i.e. worshipping anything or any person other than Allah (SWT) constitutes disbelief, so they never call people to become disbelievers; instead, they call them to worship Allah (SWT) alone without any partners and to surrender themselves to Him.

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ ﴿٨١﴾

(81) And remember when Allah took the covenant of the Prophets saying: "Take whatever I gave you from the Book and Wisdom, and afterwards there will come to you a Messenger confirming what is with you; you must, then, believe in him and help him." Allah (SWT) said: "Do you agree and take this My Covenant as binding on you" They said: "We agree." He said: "Then bear witness and I am with you among the witnesses."

As mentioned earlier in surah *Al-Baqarah*, Allah (SWT) took a covenant from all the souls before they were sent into the physical world. At the same time, Allah (SWT) took a covenant from all the Prophets that after He has given them the Book and Wisdom, there will come a Last Messenger (SAW) and they will have to believe in him and support him. This *ayah* actually refers to the Jews and the Christians who did not believe in Prophet Muhammad (SAW). Therefore, Allah (SWT) reminds them of that covenant which He also took from their Prophets, *Musa* (AS) and *'Isa* (AS) that even if Muhammad (SAW) were sent in their time, they would have to believe in him and support him. *"Allah (SWT) said: "Do you agree and take this My Covenant as binding on you" They said: "We agree." He said: "Then bear witness and I am with you among the witnesses."."* i.e. all the prophets accepted the covenant and promised and testified that their followers will carry out the terms of the covenant.

But Allah (SWT) says: *"And they ascribe a lie to Allah (SWT) while they know it"* i.e. they distorted their Books and deliberately invented these lies against Allah (SWT).

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

(76) But those who fulfill their covenant and fear Allah then verily, Allah loves the pious.

The fulfillment of a covenant is the quality of a pious person who fears Allah (SWT) and these are the people who are most beloved to Him.

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾

(77) Verily those who sell the covenant, of Allah and their own oaths for a paltry price, they shall have no share in the Hereafter. Allah will neither speak to them nor look at them on the Day of Resurrection, nor will He purify them and they shall have a painful torment.

Those who break their covenant and barter it for small and ephemeral benefits in this world will have no share in the rewards to be given on the Day of Judgment nor will Allah (SWT) bestow His mercy on them and in fact they will be dealt in a severe manner and a woeful punishment awaits them which will torment them for ever.

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾

(78) And there are some among them who distort the Book with their tongues, so that you may think it is a part of the Book but it is no part of the Book and they say "This is from Allah" but it is not from Allah (SWT); and they tell a lie against Allah while they know it.

Allah (SWT) describes the characteristics of the Jews who have distorted their Books and changed their meanings in order to mislead people from the truth. They make the simple-minded people believe that this is from Allah (SWT), but in fact these are their own self-invented beliefs which are nothing but lies. Thus they knowingly ascribe a falsehood to Allah (SWT).

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّىْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾

(79) It is not (possible) that a man to whom Allah has given the Book and Wisdom and Prophet hood should say to people: "Be my worshippers rather than Allah's" on the contrary (he would say): "Be devoted servants of your Lord, because you are teaching the Book and you are studying it."

(73) And believe in none except those that follow your religion". Say: "True guidance is the guidance of Allah (SWT) (Do not believe) that any one will get the like of that you have received, or they will ever dispute with you in your Lord's presence." Say: "All bounties are in the hand of Allah. He grants them to whom He pleases and Allah is All-Embracing, All-Knowing."

The Jews said to those who were sent to *Madinah* to execute their wicked plan and not expose their knowledge of *Torah* regarding the advent of the last Prophet and other prophesies to the Muslims lest they might use it as evidence against them. But Allah (SWT) states that those who receive guidance receive it from Him and none is able to mislead them. Therefore, such tricks of the Jews would not avail them anything and He guides whom He wills to the right faith. *"And Allah (SWT) is All-Embracing, All-Knowing"* i.e. Allah (SWT) knows who deserves honor and guidance.

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِۦ مَن يَشَآءُ ۚ وَٱللَّهُ ذُو ٱلْفَضْلِ ٱلْعَظِيمِ ﴿٧٤﴾

(74) He chooses for His mercy whom He pleases, Allah is the Owner of great bounty.

He is merciful to whom He wills, His grace is infinite.

وَمِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَٰبِ مَنْ إِن تَأْمَنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدِّهِۦٓ إِلَيْكَ ۖ وَمِنْهُم مَّنْ إِن تَأْمَنْهُ بِدِينَارٍ لَّا يُؤَدِّهِۦٓ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ
عَلَيْهِ قَآئِمًا ۗ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا۟ لَيْسَ عَلَيْنَا فِى ٱلْأُمِّيِّـۧنَ سَبِيلٌ ۖ وَيَقُولُونَ عَلَى ٱللَّهِ ٱلْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾

(75) Among the People of the Book there are some who, if you trust them with a heap of gold, will readily return it back and there are others who, if trusted with a single silver coin will not repay it back unless you constantly stand demanding. Because they say, "We are not going to be called to account with regard to the non-Jewish Arabs (Gentiles)." And they ascribe a lie to Allah while they know it.

In this *ayah*, Allah (SWT) acknowledges the honesty and integrity of some Jews and Christians who were sincere in their faith and obedient to Allah (SWT) and trustworthy in their worldly dealings. On the other hand, most of them were deceitful people who, whenever an opportunity arose, would try to usurp the wealth and properties of others unlawfully. *"Because they say, "We are not going to be called to account with regard to the non-Jewish Arabs (Gentiles)."* i.e. the Jews differentiate between the Israelites and non-Israelites. They believe that it is fair to be unjust in their dealings with non-Israelites and usurp their properties by whatever means. But they do not allow the same towards a fellow Israelite. This is because they only consider themselves as humans and believe that all gentiles [11] are animals. As it is said in *Talmud* [12]: *"All gentile children are animals"* [13] and at another place it is said, *"When a Jew murders a gentile, there will be no death penalty. What a Jew steals from a gentile he may keep"* [14].

This refers to the Jews who wished to misguide the believers and take them away from Islam but Allah (SWT) says that this behavior will backfire upon them and they will misguide none but themselves due to their arrogance and envy, but they do not realize it.

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَكۡفُرُوۡنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنۡتُمۡ تَشۡهَدُوۡنَ ۝

(70) O People of the Book! Why do you deny the revelations of Allah, while you bear witness?

i.e. why do you deny Prophet Muhammad (SAW) and the *ayaat* revealed to him when you yourself know that it is the truth and you bear witness to the fact that you were foretold about the advent of this Prophet in your scriptures.

يٰٓاَهۡلَ الۡكِتٰبِ لِمَ تَلۡبِسُوۡنَ الۡحَقَّ بِالۡبَاطِلِ وَتَكۡتُمُوۡنَ الۡحَقَّ وَاَنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

(71) O People of the Book! Why do you confound the truth with falsehood and conceal the truth while you know.

i.e. you know that what Prophet Muhammad (SAW) has brought is the truth but you hide it in your Books and conceal the truth deliberately.

وَقَالَتۡ طَّآئِفَةٌ مِّنۡ اَهۡلِ الۡكِتٰبِ اٰمِنُوۡا بِالَّذِىۡۤ اُنۡزِلَ عَلَى الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَجۡهَ النَّهَارِ وَاكۡفُرُوۡۤا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمۡ يَرۡجِعُوۡنَ ۝

(72) Some of the People of the Book say to one another: "Believe in what is revealed to the believers in the morning and deny it in the evening; so that they may turn back.

This was one of the tricks of the Jews to make a show of belief for a short span of time and then immediately renounce their belief so as to deceive the simple-minded Muslims who were weak in their religious conviction and take them back to disbelief. For this purpose, they sent people to *Madinah*, who would openly accept Islam in the day and then turn back to their religion by nightfall so as to create doubts in peoples' hearts about Islam and the teachings of Prophet Muhammad (SAW). This is the reason for which Islam has ordained the punishment for apostasy. In an Islamic state, a person who abandons Islam is firstly asked to repent but if he does not repent and does not return to the true religion, then he should be killed as an apostate and a disbeliever, because of the command of the Prophet (SAW): *"The blood of a Muslim, who confesses that none has the right to be worshipped but Allah and that I am His Apostle, cannot be shed except in three cases: In Qisas for murder, a married person who commits illegal sexual intercourse and the one who reverts from Islam (apostate) and leaves the Muslims."* [10]

وَلَا تُؤۡمِنُوۡۤا اِلَّا لِمَنۡ تَبِعَ دِيۡنَكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنۡ يُّؤۡتٰٓى اَحَدٌ مِّثۡلَ مَاۤ اُوۡتِيۡتُمۡ اَوۡ يُحَآجُّوۡكُمۡ عِنۡدَ رَبِّكُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡفَضۡلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤۡتِيۡهِ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۝

legislated by Allah (SWT). *"Then if they turn away, say: "Bear witness that we are Muslims.""* i.e. If they (*Jews* and *Christians*) do not respond to this call, then let them know that unlike them you have submitted yourselves to Allah (SWT).

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(65) O people of the Book! Why do you argue with us about Abraham, while the Torah and the Injeel were not revealed till after him? Have you then no sense.

i.e. why do the Jews and the Christians dispute with the Muslims about Prophet *Ibrahim* (AS), claiming that he was one of them, although they know that the *Torah* given to *Musa* (AS) and the *Injeel* given to *'Isa* (AS) were revealed long after him and thus it becomes immaterial to claim whether *Ibrahim* (AS) was a Jew or a Christian.

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حٰجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(66) So far you have been disputing about which you had some knowledge! But why are you arguing about that of which you have no knowledge. Allah knows and you do not know.

The Jews and the Christians do not have any knowledge about the religion of Ibrahim (AS) and yet they argue about it, whereas Allah (SWT) knows that he was a Muslim i.e. one who surrendered wholly to Allah (SWT).

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(67) Abraham was neither a Jew nor a Christian but he was a Muslim, true in faith. And he was not one of those who associate partners with Allah.

This is the answer to the arguments of the Jews and the Christians who claimed Prophet *Ibrahim* (AS) to be one of them. Allah (SWT) explicates that he (AS) was neither a *Jew* nor a *Christian* but a pure, *Hanif* [9] Muslim i.e. one wholly devoted and obedient to Allah (SWT).

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

(68) Verily, those of mankind who have the best claim to Abraham are those who followed him and this Prophet and those who have believed. And Allah (SWT) is the Protector and Helper of the believers.

Those who can best be described as closest to *Ibrahim* (AS) are the ones who follow him and Prophet Muhammad (SAW). *"And Allah (SWT) is the Protector and Helper of the believers"* i.e. Allah (SWT) is the guardian of those who believe in all His Messengers and are faithful.

وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝

(69) Some of the People of the Book want to lead you astray, but they shall not lead astray anyone except themselves, but they perceive not.

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Aal-e-Imran

(Ayaat 64-101)

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝

(64) Say: "O people of the Book! Come to equitable agreement among us that we shall worship none but Allah and that we shall not associate any partners with Him and that we shall not take from among ourselves any lords beside Allah". Then, if they turn away, say: "Bear witness that we are Muslims."

Allah (SWT) commands Muhammad (SAW) to call the People of the Book to come to a common creed that we will worship Allah (SWT) alone and associate no partners with Him. And *"that we shall not take from among ourselves any lords beside Allah"* The Jews and the Christians used to take their rabbis and priests as their Lords as Allah (SWT) says: *"They (Jews and Christians) have taken their rabbis and priests to be their Lords beside Allah .."*[7] *Adi bin Hatim* (RAA) who reverted to Islam from Christianity after the call of the Messenger (SAW) commented upon this *ayah* and said to the Prophet (SAW) that they (i.e. Jews and Christians) did not worship them as described in this *ayah*. The Prophet (SAW) replied: *"Yes they did. They (rabbis and priests) prohibited the allowed for them (Jews and Christians) and allowed the prohibited, and the people obeyed them. This is how they worshipped them"* [8]. Similarly Saint Paul abrogated the law of *Musa* (AS) and now the Pope has the right to declare what is wrong and what is right. Therefore Prophet Muhammad (SAW) is commanded to call them to come to the common belief which is confirmed by the teachings of their own scriptures that there is none worthy of worship except Allah (SWT), so do not worship other Lords besides Him. Similarly, today in the so-called *'modern democratic society'* people refer to other authorities as their judge and legislators besides Allah (SWT). They believe in secular democracy i.e. the principle of the sovereignty of the people and their right to choose their leaders and legislate whatever law they want even if it opposes the Divine laws

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر

مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل

اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک،

اسلامی انقلاب کے مراحل، مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375 قیمت: اشاعت خاص: 400 روپے، اشاعت عام: 200 روپے

"منہج انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 قیمت اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501